ماہنامہ

اشراق

لاہور

اگست ۲۰۲۴ء

1979 سے جاری شدہ
اشاعت کے 45 سال

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

”انسان ایک مخلوق ہے۔ اس کی وجودی بقا اور اس کی شخصی بقا اگر فنا یا زوال کے خطرے سے دوچار ہو تو یہ اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بقا کا مسئلہ اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے تمام مادی، انسانی اور معنوی متعلقین تک پھیلا ہوا ہے۔ حقیقت میں یہیں سے انسان کی آزمایش شروع ہوتی ہے۔ اخلاق کی آزمایش، اپنے آدرشوں کے ساتھ وفا کا امتحان، اگر انسان مذہبی ہے تو آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنے کی جانچ، کسی مقصد کے لیے فعال (active) ہے تو اس کو نبھانے کی ابتلا۔“

—— شذرات

- انبیا علیہم السلام جن حقائق کی تعلیم دیتے ہیں، اُن کی تفہیم کے لیے تمثیل کا اسلوب سب سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ (قرآنیات)
- اخلاق عالیہ انسان کی فطرت ہیں۔ لہٰذا وہ غلط بھی کر رہا ہو تو اس غلطی کا اخلاقی جواز تخلیق کرنے پر مجبور ہے۔ اگرچہ میزان عدل میں اس کی حیثیت پرِ کاہ کی بھی نہ ہو۔ (شذرات)
- ایمان و اخلاق اور صدق و اخلاص کے ساتھ کیا جانے والا عمل تزکیۂ نفس اور رضاے الٰہی کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ (نقد و نظر)
- انسان اندھا اور بہرا پیدا نہیں ہوا، بلکہ وہ اخلاقی شعور اور ذات خداوندی کا شعور لے کر پیدا ہوا ہے۔ (یسئلون)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۶ شمارہ ۸ اگست ۲۰۲۴ء صفر المظفر ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات		
انسان سے معاملہ	طالب محسن	۴
قرآنیات		
البیان: الزمر ۳۹: ۲۱-۳۵ (۲)	جاوید احمد غامدی	۷
معارف نبوی		
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین نسل میں بعثت	جاوید احمد غامدی / محمد رفیع مفتی	۱۴
مقالات		
’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟(۵)	ساجد حمید	۱۹
سیر و سوانح		
مہاجرین حبشہ (۳۳)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۰
نقطۂ نظر		
حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے پہلی وحی کا تجربہ	کوکب شہزاد	۳۸
فکر اسلامی کو درپیش جدیدیت کے چیلنج اور مدارس اسلامیہ	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۴۷
نقد و نظر		
رفقاے المورد کے نام	محمد ذکوان ندوی	۵۹
یسئلون		
اچھے اعمال والے غیر مسلم	شاہد رضا	۷۱
غیر مسلم کو مسجد میں عبادت کی اجازت	؍	۷۲
شخصیات		
حیات امین احسن (۱۱)	محمد بلال	۷۴

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد
طالب محسن
ڈاکٹر عبید الرحمٰن
ڈاکٹر شہزاد سلیم
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر
اظہار احمد
جنید حسن
محمد رفیع مفتی
محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر ساجد حمید
آصف افتخار
خورشید احمد ندیم
کوکب شہزاد
مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

شذرات

طالب محسن

انسان سے معاملہ

دنیا کے کاموں میں سب سے مشکل کام انسانوں سے معاملہ کرنا ہے۔ انسان بہت ہی پیچیدہ شخصیت رکھتا ہے۔ یہ مجموعۂ اضداد ہے۔ یہ اصول و ضوابط کی پابندی بھی کرتا ہے اور آرزوؤں اور مفادات کے زور پر تجاوز بھی کر ڈالتا ہے۔ نیک اور صلح جو ہوتے ہوئے بعض اوقات فساد کا رنگ پکڑ لیتا ہے۔ علم اور فکر کا حامل ہو، تب بھی جہالت کا مرتکب ہوتا ہے۔ جب وہ محبت کر رہا ہوتا ہے، تب بھی بعض اوقات اپنی انا کی حفاظت سے دست بردار ہونا قبول نہیں کرتا اور جب وہ دشمنی پر اتر آتا ہے، تب بھی اخلاقی اصولوں کی پاس داری سے ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ بڑے بڑے آدرش اپناتا ہے اور بعض اوقات ایسے اقدامات کر ڈالتا ہے جو پاتال میں گرنے کی گواہی دیتے ہیں۔ بعض لوگ پستی میں گرے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن کسی مرحلے پر شاہین کے ہم پرواز دکھائی دیتے ہیں۔ وہ متفق ہوتا ہے، لیکن اختلاف رکھتے ہوئے اور وہ اختلاف کر رہا ہوتا ہے، لیکن اتفاق چھپاتے ہوئے۔

اخلاق عالیہ انسان کی فطرت ہیں۔ لہٰذا وہ غلط بھی کر رہا ہو تو اس غلطی کا اخلاقی جواز تخلیق کرنے پر مجبور ہے۔ اگرچہ میزان عدل میں اس کی حیثیت پر کاہ کی بھی نہ ہو۔ شاید اسی طرح کے مظہر کو قرآن مجید نے ’اللہ سے مخادعت‘ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ چیز صرف مذہب ہی کے حوالے سے مشہود نہیں ہے، تعلقات اور معاملات میں بھی اس کا ظہور ہوتا ہے۔ افراد اپنے اقدامات اور فیصلوں کو اخلاقی جواز سے قابل قبول بناتے ہیں اور اس کے پردے میں ان کی کم زوریاں چھپی رہتی ہیں۔ انسان کی انا اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ سادگی سے اپنی خطا اور کم زوری کا اعتراف نہ کرے، بلکہ اسے اپنی توجیہ کے زور پر جائز اور برمحل عمل ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

اوپر بیان کردہ تفصیل کسی مجرم کی شخصیت کا بیان نہیں ہے، بلکہ یہ ایک معقول، شریف اور باوفا آدمی سے پیش آنے والی بعض صورتوں کا تذکرہ ہے۔ مجرمانہ شخصیت سے بھی بعض اوقات خیر کی بات کا تجربہ ہوتا ہے، لیکن اس کی شخصیت کا اصل تعارف بے ایمان، دھوکے باز، چور، ڈاکو، قاتل اور زناکار جیسے الفاظ ہیں۔ ہم جن افراد کی بات کر رہے ہیں، ان کا اصل تعارف اصحاب خیر کا ہے، لیکن ان سے کبھی کبھی اس کے برعکس جو صادر ہوتا ہے، اس کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔

انسانوں کے باہمی تعلقات میں بھی اسی طرح متضاد عناصر کی جھلک نظر آتی ہے۔ انسانی تعلق رشتے کا بھی ہے اور انسانی تعلق کا سبب نظریہ، مذہب، زبان، وطن اور نسل وغیرہ بھی بنتے ہیں۔ اصلاً ہر تعلق کا عملی ظہور خیر خواہی، وفا، حمایت، غیرت، ہم آہنگی اور کام آنے کی صورت میں ہوتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عملی زندگی میں تعلق کے یہ مظاہر بہترین رشتوں میں بھی پوری شان سے نظر نہیں آتے۔ ہم عام طور پر اس صورت حال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انسان کے بارے میں بری رائے قائم کر لیتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر اچھا ہے۔ البتہ کچھ اسباب کے تحت وہ تعلق کے بعض معیارات کو بعض اوقات پورا نہیں کر پاتا۔ اس میں یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ وہ تو تعلق کے تقاضے اپنی طرف سے پورے کر رہا ہوتا ہے، لیکن شکایت کرنے والے کو کمی لگ رہی ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ ہم نے اوپر اس تضاد کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ ان تضادات کی کنہ یہ ہے کہ انسان ایک مخلوق ہے۔ اس کی وجودی بقا اور اس کی شخصی بقا اگر فنا یا زوال کے خطرے سے دوچار ہو تو یہ اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بقا کا مسئلہ اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے تمام مادی، انسانی اور معنوی متعلقین تک پھیلا ہوا ہے۔ حقیقت میں یہیں سے انسان کی آزمایش شروع ہوتی ہے۔ اخلاق کی آزمایش، اپنے آدرشوں کے ساتھ وفا کا امتحان، اگر انسان مذہبی ہے تو آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنے کی جانچ، کسی مقصد کے لیے فعال (active) ہے تو اس کو نبھانے کی ابتلا۔

انسان جب فیصلہ کرتا ہے تو اس کے پیچھے حسن و قبح، حق و باطل اور مفید و مضر کے معروضی معیارات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کے فیصلوں پر اس کی آرزوؤں اور اس کے ذاتی اہداف کا پرتو بھی ہوتا ہے۔ انسان تعلقات کے ایک مکڑی جالے میں دھنسا ہوا ہے، جس کے دھاگوں کو ہم تعصب، محبت، نفرت، حمیت، وفا اور استقامت سے موسوم کر سکتے ہیں یا ان کو خاندان، دوستی، گروہ، قبیلہ، فرقہ، مذہب اور وطن کا نام بھی دے

سکتے ہیں۔ یہ دھاگے بھی انسان کے فیصلوں کے بننے اور ٹوٹنے میں اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

ایک طرف یہ پیچیدگی خالق کائنات نے جو امتحان برپا کر رکھا ہے اس کی وسعت، گیرائی اور گہرائی کو واضح کرتی ہے۔ انسان کا دعواے اخلاص، اس کا عزم استقامت، اس کی حاضر باشی، اس کی ایثار کشی اور اس کی پابندی احکام ہر چیز پرکھ کے ترازو میں تل رہی ہے اور اس میں بڑا حصہ انسانوں سے پیش آنے والے اس معاملے کا ہے۔

دوسری طرف انسان کو سبق دیتی ہے کہ وہ دوسرے کے بارے میں راے قائم کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ کوئی انسان جب کوئی عمل یا فیصلہ کرتا ہے یا رویہ اختیار کرتا ہے تو اس کے اسباب و محرکات کیا ہوتے ہیں۔ کوئی منفی عمل کسی شخص کے منفی ہونے کی دلیل نہیں ہے، جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ اس کے محرکات کیا تھے۔

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الزمر

(۲)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ
ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ
حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٢١﴾
اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ

(یہ سمجھتے ہیں کہ اِن کے اقتدار پر زوال نہ آئے گا)؟ تم نے دیکھا نہیں، (اے پیغمبر کہ) اللہ نے آسمان سے پانی اتارا اور زمین میں اُس کے چشمے بہا دیے۔ پھر وہ اُس سے طرح طرح کے رنگ بدلتی کھیتی نکالتا ہے، پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے تو اُس کو تم دیکھتے ہو کہ زرد پڑ گئی ہے۔ پھر وہ اُس کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اِس میں، یقیناً عقل والوں کے لیے بڑی یاد دہانی ہے۔[۳۰] ۲۱

(اِن پر افسوس، اِن کے دل سخت ہو گئے)۔ پھر کیا وہ جن کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا

۳۰۔ یعنی اِس بات کی یاد دہانی کہ اِس دنیا کی ہر چیز عارضی ہے، لہٰذا ہر عاقل کی نگاہ خدا کی اُس ابدی بادشاہی پر رہنی چاہیے جو آگے اُس کی منتظر ہے۔

لِّلۡقٰسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مِّنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۲﴾
اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ

ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہیں، اُن لوگوں کے برابر ہو جائیں گے جن کے دل سخت ہو چکے ہیں؟ سو خرابی ہے اُن کے لیے جن کے دل اللہ کی یاددہانی کے معاملے میں سخت ہو گئے۔ یہی کھلی گم راہی میں ہیں۔ ۲۲

(لوگو)، اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب کی صورت میں جس کا ہر جزو دوسرے سے ہم رنگ [۳۱] اور جس کی سورتیں جوڑے جوڑے ہیں۔ [۳۲] اِس سے اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے

۳۱۔ یہ ہم رنگی اور مشابہت ایسی واضح ہے کہ اِسے قرآن کا ہر قاری محسوس کر سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اگر آپ قرآن کی تلاوت کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار سامنے آتا ہے۔ ایک مبتدی یہ دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے، لیکن قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن تکرار محض سے بالکل پاک ہے۔ اُس میں ایک بات جو بار بار آتی ہے تو بعینہٖ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں آتی، بلکہ ہر جگہ اُس کے اطراف و جوانب اور اُس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مقام کی مناسبت سے اُس میں مناسب حال تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے، دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے، ایک جگہ اُس کا اصل رخ غیر معین ہوتا ہے، دوسرے سیاق و سباق میں وہ رخ بالکل معین ہو جاتا ہے۔ بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مدتوں کا تجربہ تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے، دوسری آیت میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی، لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔

قرآن کا یہ اسلوب، ظاہر ہے کہ اِسی مقصد کے لیے ہے کہ اِس کی ہر بات طالب کے ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ میں بطور تحدیث نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر قرآن کی مشکلات جتنی خود قرآن سے واضح ہوئی ہیں، دوسری کسی بھی چیز سے واضح نہیں ہوئی ہیں۔ میر انیس نے کہا ہے کہ:

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ
هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٢٣﴾
اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ

ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر اُن کے جسم [۳۳] اور اُن کے دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک پڑتے ہیں۔ [۳۴] یہ اللہ کی ہدایت ہے، اِس سے وہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت بخشتا ہے (اور اُسی کے مطابق گم راہ بھی کرتا ہے)، اور جس کو اللہ گم راہی میں ڈال دے، اُسے پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ ۲۳

پھر کیا جو قیامت کے دن برے عذاب کی مار اپنے چہرے پر روکے گا، [۳۵] وہ اِن ہدایت پانے

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ممکن ہے خود اُن کے اپنے کلام کے بارے میں یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو، لیکن قرآن کے باب میں یہ بات بالکل حق ہے۔ ایک ایک بات اتنے گوناگوں و بوقلموں اسلوبوں سے سامنے آتی ہے کہ اگر آدمی ذہن سلیم رکھتا ہو تو اُس کو پکڑ ہی لیتا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۱/ ۲۸)

۳۲۔ یہ بھی، ظاہر ہے کہ اُسی مقصد سے ہے، جس کی وضاحت اوپر ہوئی ہے۔

۳۳۔ لفظ ’جُلُوْد‘ اِس آیت میں رونگٹوں کے معنی میں بھی آیا ہے اور پورے جسم کے معنی میں بھی۔ یہ اِس قاعدے کے مطابق ہے کہ عربی زبان میں کل بول کر جزو بھی مراد لیا جاتا ہے اور جزو بول کر کل بھی۔

۳۴۔ آیت میں لفظ ’تَلِيْنُ‘ آیا ہے جس کے بعد ’اِلٰى‘ کا صلہ ہے۔ اِس سے یہ ’مَيْل‘ کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔ اِس میں جسم کے نرم ہو کر جھک پڑنے کی جو تعبیر اختیار کی گئی ہے، اُس سے مراد یہ ہے کہ اُن کے اندر کبر و غرور کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’... آدمی کے اندر کبر و غرور ہو تو اُس کی گردن تنی ہوئی، جسم اکڑا ہوا رہتا ہے اور وہ زمین پر پاؤں دھمکتے ہوئے چلتا ہے۔ برعکس اِس کے جن کے اندر خدا کا خوف ہو، اُن کے اندر فروتنی و تواضع ہوتی ہے جس کا اثر اُن کی چال ڈھال اور اُن کے جسم کی ایک ایک ادا سے نمایاں ہوتا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۶/ ۵۸۳)

۳۵۔ یہ انتہائی بے بسی کی تصویر ہے، اِس لیے کہ آدمی، جب تک اپنی مدافعت پر کچھ بھی قادر ہوتا ہے، اپنے

ذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۲۴﴾

كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتٰىهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۵﴾
فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡىَ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ ۘ لَوۡ كَانُوۡا
يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ۚ ﴿۲۷﴾

والوں کے برابر ہو جائے گا؟ ایسے ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب چکھو اُس کمائی کا مزہ جو تم کرتے رہے۔ ۲۴

اِن سے پہلے والوں[۳۶] نے بھی اِسی طرح جھٹلا دیا تھا تو اُن پر ہمارا عذاب وہاں سے آگیا، جہاں سے اُن کو خیال بھی نہ تھا۔[۳۷] پھر اللہ نے اُن کو دنیا کی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا[۳۸] اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش، یہ لوگ اِس کو سمجھتے! ۲۵-۲۶

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں،[۳۹] اِس لیے کہ وہ یاد دہانی

چہرے پر کبھی مار نہیں پڑنے دیتا۔

۳۶۔ یہ اُن قوموں کی طرف اشارہ ہے جن پر رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا۔

۳۷۔ یہ اُس سنت کے مطابق ہوا جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی تکذیب کرنے والوں کے لیے مقرر ہے۔ ہم پیچھے جگہ جگہ اِس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں۔

۳۸۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے حق کے مقابل میں سرکشی اور استکبار کا رویہ اختیار کیا اور اِس جرم کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت اور رسوائی کا عذاب ہی ہے۔

۳۹۔ انبیا علیہم السلام جن حقائق کی تعلیم دیتے ہیں، اُن کی تفہیم کے لیے تمثیل کا اسلوب سب سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ الہامی صحائف میں اِسی بنا پر اِسے بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ تورات، زبور، انجیل سب امثال سے معمور ہیں اور سلیمان علیہ السلام کے صحیفۂ حکمت کا تو نام ہی ''امثال'' ہے۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا
رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ
مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٩﴾

حاصل کریں۔ ایسے قرآن کی صورت میں جو عربی زبان میں ہے، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ نہیں ہے،[۴۰] اِس لیے کہ وہ خدا کے عذاب سے بچیں۔[۴۱] (یہ شرک اور توحید کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو) اللہ (اِن کے لیے) ایک غلام کی تمثیل بیان کرتا ہے جس میں کئی آقا شریک ہیں جو آپس میں کشمکش رکھتے ہیں[۴۲] اور ایک دوسرے غلام کی جو پورا کا پورا ایک ہی شخص کی ملکیت ہے۔ کیا اِن دونوں کا حال یکساں ہو گا؟ (ہرگز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ) شکر کا سزاوار صرف اللہ ہے، لیکن اِن میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۴۳] ۲۷-۲۹

۴۰۔ یعنی کوئی بات فلسفیانہ اینچ پینچ کے اسلوب میں نہیں کہی گئی، بلکہ جو کچھ فرمایا ہے، فصیح و بلیغ زبان میں اور نہایت سادہ اور دل پذیر اسلوب میں فرمایا ہے جس سے متکلم کا مدعا ہر جگہ بغیر کسی ابہام کے اور پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔

۴۱۔ یہی وہ آخری مقصد ہے جس کے لیے قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے اِس اہتمام کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔

۴۲۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ ایک سے زیادہ خداؤں کے درمیان یہ کشمکش ناگزیر ہے۔ چنانچہ دنیا کے تمام مشرکین اپنے دیوتاؤں کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ اُن میں سے بیش تر کے درمیان ایسی رقابت اور چشمک رہتی ہے جو بعض اوقات مدتوں کے لیے جنگ و جدال کا باعث بن جاتی ہے۔

۴۳۔ یہ توحید کی نفسیاتی دلیل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... مطلب یہ ہے کہ کوئی غلام بھی اِس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ ایک آقا کی غلامی کی جگہ اُس کو ایک سے زیادہ مختلف الاغراض اور برسرِ نزاع آقاؤں کی غلامی کرنی پڑے۔ انسانی فطرت ایک خدا کی غلامی پر تو اِس وجہ سے راضی و مطمئن ہے کہ اُس کے اندر جو افتقار و احتیاج ہے، خدا کو مانے بغیر اُس کا کوئی حل نہیں ملتا۔ اِس

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ
تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ
جَآءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾
وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا
يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

(اِن کی ہٹ دھرمی پر غم نہ کھاؤ، اے پیغمبر)۔ تم کو بھی یقیناً مرنا ہے اور یہ بھی مرنے والے ہیں۔ پھر طے ہے کہ تم سب لوگ اپنا مقدمہ قیامت کے دن اپنے پروردگار کے حضور پیش کرو گے۔ سو اُس دن اُن سے بڑھ کر اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا کون ہو گا جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور سچائی کو[۴۴] جھٹلا دیا، جب کہ وہ اُن کے پاس آگئی! ایسے منکروں کا ٹھکانا کیا جہنم میں نہ ہو گا؟ ۳۰-۳۲

ہاں، جو سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے[۴۵] پورے دل کے ساتھ اُس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے ہاں، جو چاہیں گے، ہو گا۔ یہ صلہ ہے اُن کا جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔ اِس لیے[۴۶] کہ جو عمل اُنھوں نے کیے تھے، اُن کے بدتر انجام کو

کی دلیل اُس کے باطن میں بھی موجود ہے اور اُس کے باہر بھی۔ رہے دوسرے اصنام و آلہہ، تو ایک خدا سے جب اُس کی احتیاج پوری ہو گئی تو وہ اُن کی غلامی کا پٹا اپنی گردن میں کیوں ڈالے! اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت سے بغاوت کرتا ہے اور اپنے آپ کو ایک ایسے مخمصے میں پھنساتا ہے جس میں پھنسنے پر کوئی ذی ہوش بھی راضی نہیں ہوتا۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۸۵)

۴۴۔ یعنی قرآن کو جو سراسر سچائی ہے۔

۴۵۔ اصل میں 'صَدَّقَ بِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے پہلے 'مَنْ' وضاحت قرینہ کی بنا پر محذوف ہے۔

۴۶۔ جزا و سزا کے جس دن کا ذکر اوپر ہوا ہے، یہ اُس کے برپا کرنے کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا وَیَجْزِیَھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

اللہ اُن سے دور کرے اور اُن کا اجر اُن کو عطا فرمائے، اُن کے اعمال کا بہترین صلہ۔[۴۷] ۳۳-۳۵

۴۷۔ آیت میں 'اَسْوَاُ' اور 'اَحْسَنُ' کے الفاظ آخرت کی جزا و سزا کے لیے استعمال ہوئے ہیں، اِس لیے کہ یہ سزا بھی ابدی ہے اور جزا بھی۔ اِس کے بعد کیا چیز ہے جو اِس سے بدتر یا بہتر ہو سکتی ہے؟

[باقی]

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین نسل میں بعثت

— ۱ —

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:[۱] «بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُونِ بَنِي آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا، حَتَّى بُعِثْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِي كُنْتُ مِنْهُ».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بنی آدم کی عہد در عہد بہترین نسلوں[۱] میں سے ہوتے ہوتے اپنی اِس نسل میں مبعوث ہوا ہوں۔

۱۔ یعنی پہلے نوح علیہ السلام اور اِس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کی نسلوں میں سے۔ یہ انبیا علیہم السلام کی نسلیں ہیں اور اِس لحاظ سے یقیناً 'خیار الناس' ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۸۸۵۷ سے لیا گیا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اِس کے تنہا راوی ہیں۔

اِس کے متابعات الفاظ کے بہت معمولی فرق کے ساتھ اِن مصادر میں منقول ہیں:

الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/۱۔ مسند احمد، رقم ۹۳۹۲۔ حدیث علی بن حجر، رقم ۳۵۳۔ صحیح بخاری، رقم ۳۵۵۷۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۶۵۵۳۔ حدیث ابی بکر المطیری، رقم ۷۔ حدیث ابی عبد اللہ النعالی، رقم ۹۷۔ معرفۃ الصحابہ، ابو نعیم، رقم ۳۱۔ شعب الایمان، بیہقی، رقم ۱۳۲۹۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۷۵/۱۔

اِس روایت کا کوئی شاہد موجود نہیں ہے۔

المصادر والمراجع

سابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (١٤٢٧ھ/٢٠٠٦م). **العلل**. ط ١. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (١٢٧١ھ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط ١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠ھ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦ھ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧ھ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط ١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: لبنان. مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د. عاصم بن عبدالله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤ھ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط ١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧ھ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن سعد محمد بن سعد. (١٤٠٨ھ). **الطبقات الكبرى**. ط٢. تحقيق: زياد محمد منصور. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

ابن عدي عبدالله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨ھ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط ١. تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠ھ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبدالقيوم عبد رب النبي. مكة المكرمة: المكتبة الإمدادية.

ابن المِبْرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣ھ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط ١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩ھ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط ١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

أبو اسحاق الحويني. (١٤٣٣ھ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط ١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو إسحٰق إسمٰعيل بن جعفر. (١٤١٨ھ/١٩٩٨م). **حديث علي بن حجر السعدي**. ط١. دراسة وتحقيق: عمر بن رفود. الرياض: مكتبة الرشد للنشر.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو نعيم احمد بن عبد الله اصبهاني. (د.ت). **معرفة الصحابة**. ط١. تحقيق: مسعد السعدني. بيروت: دار الكتاب العلمية.

أبو يعلى أحمد بن علي. (١٤٠٤ھ/١٩٨٤م). **مسند أبي يعلى**. ط ١. تحقيق: حسين سليم أسد.

دمشق: دار المأمون للتراث.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢١هـ/٢٠٠١م). **المسند**. ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط، وعادل مرشد، وآخرون. بيروت: مؤسسة الرسالة.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

البخاري محمد بن اسمعيل. (١٤٢٢هـ). **الجامع الصحيح**. ط ١. تحقيق: محمد زهير بن ناصر الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البخاري محمد بن إسماعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت. دار الفكر.

البخاري محمد بن إسماعيل الجعفي. (١٣٩٧هـ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط ١. حلب. القاهرة. دار الوعي مكتبة دار التراث.

البيهقي أبو بكر أحمد بن الحسين الخراساني. (١٤٢٣هـ/٢٠٠٣م). **شعب الإيمان**. ط١.تحقيق: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد. الرياض: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع.

البيهقي أبو بكر أحمد بن الحسين الخراساني. (١٤٠٥هـ). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١.بيروت: دار الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط ١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض. دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الأنصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط ١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة. دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحيى شفيق حسن. بيروت. دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت. عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط ١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة. مكتبة الدار.

المطيري أبي بكر محمد بن جعفر. مخطوط [المكتبة الشاملة]. من حديث المطيري عن أبي منصور الخلنجي. مصدر: الشاملة الذاهبية.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط ١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

النعالي أبو الحسن محمد بن طلحة. (٢٠٠٤م). **جزء من حديث النعالي**. ط١. الناشر: مخطوط نُشر في برنامج جوامع الكلم.

ساجد حمید

’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟

(۵)

جمع قرآن کی ایک روایت

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب تفسیری روایت کا جائزہ ہم نے لیا۔ یہ روایت سورۂ قیامہ میں جمع قرآن کے وعدے کو دوسرے معنی پہنانے کے لیے تراشی گئی تاکہ یہ مقدمہ پیش کیا جاسکے کہ قرآن کی جمع وتدوین کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہیں لیا تھا تاکہ قرآن مجید کی جمع وتدوین کو انسانی عمل قرار دے کر اس کے متن کو غیر مربوط قرار دیا جائے اور اس کے سیاق وسباق کو ناقابل حجت بنادیا جائے۔ مثلاً قرآن اگر صحابہ نے بعد میں جمع کیا ہے تو وہ الٰہی اور نبوی نگرانی سے محروم ہونے کی وجہ سے، اس تصدیق سے محروم ہو جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے بارے میں دی ہے۔ غرض قرآن کے موجودہ متن کے توقیفی مرتب ہونے کے تصور کو مجروح کرنے کے لیے ایک راستہ یہ اختیار کیا گیا کہ اللہ کا وعدۂ جمع وتدوین کے معنی بدل دیے جائیں، کہ وہ تو بس نبی کے دل میں حفظ کرانا ہے۔ تو دوسری طرف قرآن کے جمع کرنے کی ایک تاریخ بھی مدون کی جائے کہ جس سے مصحف کے غیر محفوظ ہونے کا عیب لگایا جاسکے۔ اب اس مضمون میں زیر بحث روایات سے یہ تاثر تاریخ میں رقم کر دیا گیا کہ اس کی آیات تو دو دو صحابہ کی گواہی کی مرہون منت تھیں۔ نہ جانے کتنی آیات تلاش میں رہ گئیں، نہ جانے ستر صحابہ کے شہید ہو جانے کے نتیجے میں کتنی آیات یا سورتیں ضائع ہو گئی ہوں گی، اس لیے کہ دو آیتیں

تو صرف ایک صحابی کے پاس سے ملیں، جن کے لیے بس انھی کی گواہی میسر تھی۔ اسی بات کو پیش کرنے کے لیے جمع قرآن کی یہ روایات وضع (forge) کی گئیں۔ پھر انھیں مشہور کرنے کے لیے جگہ جگہ بیان کیا گیا تاکہ یہ نیا وضع کردہ تصور رائج ہو جائے۔

اس میں پہلا کام کون سا ہوا، پہلے یہ تاریخ لکھی گئی یا سورۂ قیامہ کی آیات کی تاویل پہلے کی گئی، یہ شاید بتانا مشکل ہو، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ یہ دونوں کام یکے بعد دیگرے ہوئے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے لیے ممد و معاون ہوں۔ سورۂ قیامہ کی آیات کے بہتر فہم اور اس پر اٹھنے والے وہ سوالات جو تاریخ جمع قرآن سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے تسلی بخش جواب کے لیے ضروری ہے کہ جمع قرآن کی روایات کا جائزہ بھی لیا جائے۔ اس مقصد سے ہم اس مضمون میں جمع قرآن کی ایک روایت کو بھی شامل کر رہے ہیں، گو یہ تفسیری روایت نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ جمع قرآن سے متعلق ان روایات پر پہلے بھی کام ہوا ہے، اور آپ کو یہاں کچھ نکات ایسے ملیں گے جو مجھ سے پہلے بیان ہو گئے ہیں، میں نے انھیں، بلا حوالہ، یہاں اس مقصد سے بیان کر دیا ہے کہ میرے نکات کے ساتھ ساتھ وہ سب نکات بھی میرے ہی پیرایۂ بیان میں یکجا ہو جائیں۔ بعض بہت اہم نکات اس میں نئے ہیں، جن سے اس تحقیق کو تقویت ملے گی کہ قرآن عہد نبوی ہی میں مصحف کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع قرآن سے متعلق یہ ایک روایت اتنی معروف ہے کہ ایک بڑی اکثریت نے جمع قرآن کی تاریخ اسی کی بنیاد پر رقم کی ہے۔ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت زید رضی اللہ عنہم کے جمع قرآن کو بیان کرنے والی یہ روایت بخاری کے الفاظ میں یوں ہے:

عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي ابْنُ السَّبَّاقِ، أَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ الأَنْصَارِيَّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ - وَكَانَ مِمَّنْ يَكْتُبُ الوَحْيَ - قَالَ: أَرْسَلَ إِلَيَّ أَبُو بَكْرٍ مَقْتَلَ أَهْلِ اليَمَامَةِ وَعِنْدَهُ عُمَرُ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّ عُمَرَ أَتَانِي، فَقَالَ: إِنَّ القَتْلَ قَدْ اسْتَحَرَّ يَوْمَ اليَمَامَةِ بِالنَّاسِ، وَإِنِّي

”زہری، ابن سباق سے اور وہ حضرت زید بن ثابت، جن کا شمار کاتبین وحی میں ہوتا ہے، سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ حضرت ابو بکر نے جنگ یمامہ کے موقع پر مجھے بلا بھیجا، جب کہ حضرت عمر بھی وہیں تھے۔ انھوں نے کہا کہ عمر نے آکر مجھے کہا ہے کہ یمامہ میں لوگوں کی شہادتیں بہت ہوئی ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ حفاظ

أَخْشَى أَنْ يَسْتَحِرَّ القَتْلُ بِالقُرَّاءِ فِي المَوَاطِنِ، فَيَذْهَبَ كَثِيرٌ مِنَ القُرْآنِ إِلَّا أَنْ تَجْمَعُوهُ، وَإِنِّي لَأَرَى أَنْ تَجْمَعَ القُرْآنَ، قَالَ أَبُو بَكْرٍ: قُلْتُ لِعُمَرَ: كَيْفَ أَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ عُمَرُ: هُوَ وَاللهِ خَيْرٌ، فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِي فِيهِ حَتَّى شَرَحَ اللهُ لِذَلِكَ صَدْرِي، وَرَأَيْتُ الَّذِي رَأَى عُمَرُ.

قَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ: وَعُمَرُ عِنْدَهُ جَالِسٌ لاَ يَتَكَلَّمُ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ، وَلاَ نَتَّهِمُكَ، كُنْتَ تَكْتُبُ الوَحْيَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَتَتَبَّعِ القُرْآنَ فَاجْمَعْهُ، فَوَ اللهِ لَوْ كَلَّفَنِي نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الجِبَالِ مَا كَانَ أَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا أَمَرَنِي بِهِ مِنْ جَمْعِ القُرْآنِ، قُلْتُ: كَيْفَ تَفْعَلاَنِ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟

فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: هُوَ وَاللهِ خَيْرٌ، فَلَمْ أَزَلْ أُرَاجِعُهُ حَتَّى شَرَحَ اللهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ اللهُ لَهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ، فَقُمْتُ فَتَتَبَّعْتُ القُرْآنَ أَجْمَعُهُ

کے لیے ایسی شہادتیں مختلف جنگوں پر مہلک ثابت ہوں، جس سے قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے، سوائے اس کے کہ آپ اسے جمع کر لیں۔ میری پختہ رائے ہے کہ آپ، (اے ابو بکر)، اسے جمع کریں۔ حضرت ابو بکر نے کہا: میں نے یہ جواب دیا کہ میں وہ کام کیسے کروں جسے نبی کریم نے نہیں کیا! مگر عمر نے کہا: بخدا یہ ایک بھلا کام ہے۔ پھر بار بار مجھے آ کر اصرار کیا ہے۔ اب اللہ نے میرا دل بھی اس بات کے لیے کھول دیا ہے۔ اب جو رائے عمر کی تھی، وہی میری بھی ہے۔

زید کہتے ہیں کہ عمر وہاں خاموش بیٹھے تھے تو ابو بکر نے کہا: تم جوان اور سمجھ دار ہو اور تمھیں ہم تہمت سے پاک جانتے ہیں۔ تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن لکھا بھی کرتے تھے، تو تم ڈھونڈ ڈھونڈ کر قرآن جمع کرو۔ زید نے کہا: اللہ کی قسم ابو بکر مجھے یہ کام سونپتے کہ ایک پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دوں تو یہ مجھ پر اتنا گراں نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کا کام مجھے گراں لگا، تو میں نے کہا کہ تم دونوں وہ کام کیسے کر سکتے ہو جو کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟

حضرت ابو بکر نے کہا: واللہ یہ کام اچھا ہے۔ پھر میں نے بار بار مراجعت کی، حتیٰ کہ اللہ نے وہ بات جو ابو بکر و عمر پر کھولی تھی، مجھ پر بھی کھول دی۔ پھر

مِنَ الرِّقَاعِ وَالأَكْتَافِ وَالعُسُبِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ، حَتَّى وَجَدْتُ مِنْ سُورَةِ التَّوْبَةِ آيَتَيْنِ مَعَ خُزَيْمَةَ الأَنْصَارِيِّ لَمْ أَجِدْهُمَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ، ﴿لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولٌ مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ عَزِيزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيصٌ عَلَيۡكُم﴾ (التوبه ۹: ۱۲۸) إِلَى آخِرِهِمَا.

وَكَانَتِ الصُّحُفُ الَّتِي جُمِعَ فِيهَا القُرْآنُ عِنْدَ أَبِي بَكْرٍ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللهُ، ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللهُ، ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ. (بخاری، رقم ۴۶۷۹)

میں اٹھا اور قرآن کی تلاش میں لگ گیا، میں اسے چمڑے کے پارچوں، شانے کی ہڈیوں، کھجور کی شاخوں اور لوگوں کے حافظے سے تلاش کر کر کے جمع کرنے لگا، حتیٰ کہ یہ کام یوں انجام پایا کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں: 'لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولٌ مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ' سے آخر تک خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس سے ملیں۔

یہ جمع کردہ نسخے ابو بکر کی زندگی میں انھی کے پاس رہے، ان کے انتقال کے بعد عمر کے پاس رہے، پھر حفصہ بنت عمر کے پاس رہے (رضی اللہ عنہم اجمعین)۔"

اس روایت پر ذرا دھیان سے غور کریں تو یہ کسی طور سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔

۱۔ مثلاً پہلی بات جو ناقابل فہم ہے، وہ یہ ہے کہ 'فَيَذْهَبَ كَثِيرٌ مِنَ القُرْآنِ'[۲۶] "کہ قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا"۔ یہ جملہ یہ تاثر دیتا ہے کہ پورے قرآن کے کوئی ایک صحابی بھی حافظ نہیں تھے۔ کسی نے قرآن کا ایک حصہ یاد کر رکھا تھا تو کسی نے کوئی دوسرا۔ مثلاً کسی کو سورۂ بقرہ یاد تھی تو کسی کو آل عمران، تو یہ نہ ہو کہ شہادتوں کے بعد آل عمران والا حافظ ہی کوئی موجود نہ رہے، بعد میں ہمیں سورۂ آل عمران ملے ہی نہ! اس لیے حفاظ کے شہید ہو جانے سے اس بات کا امکان ہے کہ پورا قرآن موجود نہ رہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جائے۔ یہ جملہ درایتاً بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ کتب میں صحابہ میں حفاظ کی بڑی تعداد بتائی گئی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ بات اس مسلک کی بنیاد رکھنے کے لیے تراشی گئی ہے کہ جس کے مطابق پورا قرآن محفوظ نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا تاثر یہ جملہ یہ دیتا ہے کہ قرآن مجید پورا نہ صرف حافظے ہی میں نہیں تھا، بلکہ پورا لکھا ہوا بھی موجود نہیں تھا، اور اگر لکھا ہوا تھا بھی تو وہ ایک جگہ نہیں تھا۔ یہ تاثر بھی غلط اور تاریخی اور قرآنی حقائق کے

۲۶۔ بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں: 'فَيَذْهَبَ قُرْآنٌ كَثِيرٌ' اور بس ایک دو روایات میں 'فیذھب القرآن' کے الفاظ آئے ہیں، اس لیے روایات کی کثرت اسی مضمون کو بیان کرتی ہے کہ قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا۔

خلاف ہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا۔

۳۔ یہ جملہ بھی بہت مغالطہ آمیز ہے کہ 'كَيْفَ أَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'؟(میں وہ کام کیسے کر سکتا ہوں، جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام نہیں دیا)؟اس سے دو مغالطے پیدا کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ جمع اور حفاظت قرآن کا اہم ترین کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ کوئی بدعت نما اور ناجائز کام ہے، جو امت کا پہلا جید ترین فقیہ خلیفہ کرنے کو آمادہ نہیں ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی مشکل سے منانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ دونوں باتیں بھی حقیقت کے خلاف ہیں۔

۴۔ یہ بات بھی باعث حیرت ہے کہ حضرت ابو بکر جمع قرآن کے لیے 'فَتَتَبَّعِ الْقُرْآنَ فَاجْمَعْهُ' کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ 'تَتَبَّعْ' کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی شروع سے آخر تک لگ کر کھوج کرنا ہو گی۔ ایسا نہیں کہ کہیں قرآن ایک جگہ دستیاب ہے تو تم بس اس کو جمع کر دو، نہیں بلکہ دستیاب بھی کرو اور جمع بھی کرو۔ یہ تاثر روایت میں شروع ہی سے دیا گیا ہے کہ پورا قرآن کسی کو بھی حفظ نہیں ہے اور اب اس جملے سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ تحریری صورت میں بھی پورا قرآن ایک جگہ پر دستیاب نہیں ہے۔ اس تاثر کو حضرت زید کا یہ جملہ مزید پختہ کرتا ہے: 'فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْآنَ أَجْمَعُهُ مِنَ الرِّقَاعِ وَالأَكْتَافِ وَالعُسُبِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ'۔ گویا ایک جان کھپانے کا کام ہے، جو حضرت زید کے ذمہ لگایا جا رہا ہے۔ نہ قرآن حفاظ کے پاس پورا ہے اور نہ کہیں پورا لکھا ہوا موجود ہے، بلکہ وہ کھو یا گیا ہے اور اب اس کھوئے ہوئے قرآن کو ڈھونڈ نکالنا ہے، اور پھر اس کو محفوظ کرنا ہے۔ روایت کے آخر پر جا کر آپ کو یہ تاثر مزید پختہ ہوتا ہوا ملے گا کہ 'حَتَّى وَجَدْتُ مِنْ سُورَةِ التَّوْبَةِ آيَتَيْنِ مَعَ خُزَيْمَةَ الأَنْصَارِيِّ لَمْ أَجِدْهُمَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ' دو آیات تو ایسی تھیں کہ بس حضرت خزیمہ ہی کے پاس تھیں[۲۷]، وہ نہ کسی اور کے پاس لکھی ہوئی موجود تھیں اور نہ کسی حافظ کے حافظے میں تھیں۔ اس روایت کی فتنہ سامانی کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

۵۔ ایک جملہ 'فَوَاللّٰهِ لَوْ كَلَّفَنِي نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الجِبَالِ مَا كَانَ أَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا أَمَرَنِي بِهِ

۲۷۔ واضح رہے کہ آیات اور ان کی تعداد میں مختلف روایات میں اختلاف ہے، ہم نے دو کا ذکر اس روایت کی وجہ سے کیا ہے جو اوپر ہم نے پیش کی ہے۔ اسی مضمون کی دوسری روایتوں میں جمع قرآن سے متعلق بے شمار ناقابل یقین باتیں ہیں، لیکن ہم نے اس مضمون کو ایک روایت تک محدود رکھا ہے تاکہ بحث سمٹی رہے۔

مِنْ جَمْعِ الْقُرْآنِ‘ بھی ہے، جو یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ اس وقت قرآن کو جمع کرنا جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ پہاڑ کو اپنے مقام سے ہٹانا آسان تھا، مگر قرآن جمع کرنا نہایت مشکل تھا۔ یہ بلاشبہ دینی ذمہ داری کا بوجھ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ حضرت زید یہ سمجھتے تھے کہ میرے اوپر قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری عائد ہوئی تو یہ نہ ہو کہ کوتاہی ہو جانے کی صورت میں کل قیامت کے دن پکڑا جاؤں، لیکن یہ مدعا ماننا اس لیے مشکل ہے کہ آگے روایت میں جو قرآن جمع کرنے کی تفصیل انھوں نے بتائی ہے، وہ جمع کرنے کی مشقت کی طرف ذہن کو لے جاتی ہے، نہ کہ احساس جواب دہی کی طرف۔ جمع قرآن کی مشقت بتاتے وقت انھوں نے فرمایا ہے کہ ’...فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْآنَ أَجْمَعُهُ مِنَ الرِّقَاعِ وَالأَكْتَافِ وَالعُسُبِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ...‘ (تو میں قرآن کی طلب میں لگ گیا، میں نے اسے چمڑے کے پارچوں، شانے کی ہڈیوں، کھجور کی شاخوں اور لوگوں کے دلوں میں سے ڈھونڈ کر جمع کیا)۔ اس جملے پر ہم پہلے بات کر چکے ہیں، یہاں صرف اس لیے یہ جملہ اقتباس کر رہا ہوں کہ یہ اوپر مذکور ’پہاڑ جیسے مشکل کام‘ کی توضیح بن رہی ہے۔ اس جملے میں کلمات، مثلاً ’کلفني‘ اور ’أثقل‘ اور جملے کی بناوٹ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ عہد صحابہ کی زبان نہیں ہے، بلکہ فقہی عہد کی زبان ہے، اور فطری بول چال کی زبان بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں جملے کے تمام وہ اجزا بھی بیان ہو گئے ہیں جو بول چال کی زبان میں نہیں ہوتے تھے۔ لیکن چلیے کوئی اسے روایت بالمعنیٰ کہہ کر درگذر کر دے سکتا ہے۔

۶۔ حضرت ابو بکر صدیق کا یہ جملہ ’إِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ، وَلاَ نَتَّهِمُكَ‘ بھی دل چسپ ہے۔ مطلب یہ کہ قرآن کی جمع کرنے میں ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو جوان ہو، کیونکہ قرآن جگہ جگہ سے اکٹھا کرنا تھا۔ اس کے لیے بھاگ دوڑ کی ضرورت ہونی تھی، گھر گھر جانا تھا، ہر اینٹ روڑے کو الٹنا تھا، پھر جا کر قرآن جمع ہونا تھا۔

۷۔ حضرت زید بن ثابت کا یہ جملہ ’كَيْفَ تَفْعَلَانِ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ‘؟ موقع کلام کے لحاظ سے غیر مناسب ہے، اس لیے کہ یہ بات ابو بکر رضی اللہ عنہ انھیں بتا چکے ہیں کہ میں نے بھی عمر سے یہی کہا تھا، اور یہ کہ حضرت عمر نے کیا جواب دیا تھا، اس جواب پر اپنا رد عمل اور اپنے قائل ہونے کی تفصیل بھی بتائی تھی۔ اب یہ سوال کرنا بنتا نہیں ہے۔ مزید یہ کہ حضرت ابو بکر نے ان کے اس بے محل سوال پر جو جواب دیا، وہ پھر وہی تھا جو حضرت عمر نے دیا تھا، نہ کوئی اضافہ اور نہ کوئی تبدیلی۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ پہلے نہ زید نے ابو بکر کی بات سنی اور نہ زید نے عمر رضی اللہ عنہم کی بات سنی۔ نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس لیے دہرائی گئی ہے کہ یہ تاثر پختہ کیا جائے کہ جمع قرآن نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، اور نہ یہ کرنے کا کام تھا، اور نہ یہ کام کرنا چاہیے تھا، یہ نہ اللہ کا حکم تھا، نہ اللہ کے رسول کا قول یا عمل تھا۔ یہ تو بس ابو بکر و عمر کا اجتہاد تھا۔ اور اجتہاد بھی ایسا کہ اطمینان کی وجہ صرف حضرت عمر کا اصرار اور بس یہ کہنا تھا کہ ''یہ اچھا کام ہے''۔ ایسا اجتہاد نہیں تھا کہ سنتے ہی ابو بکر قائل ہو گئے ہوں اور سنتے ہی زید بن ثابت تیار ہو گئے ہوں۔ گویا ہر طرح سے ایک اجنبی بات تھی، جو تجویز کی جا رہی تھی۔

۸۔ اس روایت کا یہ جملہ جو حضرت زید کے منہ میں ڈالا گیا ہے کہ 'فَقُمْتُ فَتَتَبَّعْتُ القُرْآنَ أَجْمَعُهُ مِنَ الرِّقَاعِ وَالأَكْتَافِ وَالعُسُبِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ'، یہ تاثر دیتا ہے کہ قرآن جمع شدہ نہیں تھا، بلکہ بکھرا ہوا تھا، اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کہاں سے ملے گا۔ یہ خیال نہ کیجیے کہ یہ صرف 'تَتَبَّعْتُ' سے مفہوم پیدا ہوا ہے، جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں، بلکہ یہ تاثر 'أجمع من' سے بھی پیدا ہوا ہے، یعنی مجھے قرآن ان ان چیزوں سے جمع کرنا پڑا۔ اس پر 'صُدُورِ الرِّجَالِ' کا عطف یہ تاثر بھی دے دیتا ہے کہ کچھ مجھے ان لکھے ہوئے ٹکڑوں سے مل گیا اور کچھ مجھے لوگوں کے حافظے سے ملا۔ گویا بکھرا ہوا، بے ترتیب قرآن مجھے تلاش بھی کرنا پڑا اور جمع بھی۔ مزید یہ کہ پورا قرآن نہ حافظے میں تھا نہ تحریر میں، بلکہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبین وحی سے لکھوایا، وہ بھی موجود نہیں تھا۔ اس جملے 'فَقُمْتُ فَتَتَبَّعْتُ' کی ساخت بھی عجمی ہے، جس میں کام سے پہلے ہم اٹھنا بولتے ہیں کہ ''میں اٹھا اور یہ کام کیا''۔ عربی میں یہی اسلوب یوں ہوتا ہے: 'فَقُمْتُ بتتبع القرآن...'۔

۹۔ یہ 'الرِّقَاعِ وَالأَكْتَافِ وَالعُسُبِ' والا جملہ ایک اور بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس جملے کا خالق، یا تو کوئی چال چل رہا ہے یا وہ عربوں کے لکھنے لکھانے کے طریقے سے واقف ہی نہیں تھا۔ عربوں کے ہاں کھجور کی چھال، ہڈی اور پتھر کے ٹکڑوں (بخاری، رقم ۱۹۱۷) پر لکھنے کا اس روایت کے سوا کوئی اور شاہد مجھے نہیں ملا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ یہ چیزیں لکھنے کے لیے استعمال ہی نہیں کرتے تھے تو انھوں نے قرآن ان چیزوں پر کیوں لکھا؟ مثلاً ان کے معلقات لکھ کر بیت اللہ میں لٹکانے کا ذکر ملتا ہے، تو وہ کس پر لکھے ہوئے تھے۔ کسی جگہ یہ نہیں ملتا کہ یہ چیزیں لکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ جاہلی شعرا کے ہاں اگر ذکر ملتا ہے تو وہ الرَّق کا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے دو شعر عرض کیے دیتا ہوں۔ پہلا طرفہ بن العبد کا اور دوسرا اخنس بن شہاب التغلبی کا ہے:

کسطور الرق رقشه بالضحى مرقش بشمه

لابْنَةِ حِطّانَ بنِ عَوْفٍ مَنازِلُ كما رَقَّشَ العُنوانَ في الرّقّ كاتِبُ

قرآن مجید میں بھی سورۂ طور کی دوسری اور تیسری آیت میں اسی کا ذکر ہے: ’وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ. فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ‘۔ لگتا ہے کہ روایت تراشنے والے نے قرآن کو زیادہ سے زیادہ منتشر دکھانے کے لیے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے، اس لیے کہ کھجور کی چھال، پتھروں اور ہڈیوں کو باہم ملا کر کتاب کی شکل دینا مشکل تھا۔ ان کے ذکر سے روایت تراشنے والے نے ایک طرف یہ بات ثابت کی کہ کاتبین وحی اور صحابہ جو کچھ لکھتے رہے، اس کی نوعیت کیا تھی: بس ہڈیوں، چھالوں اور کھال کے پارچوں کا ایک منتشر ڈھیر۔ دوسری طرف یہ ثابت کیا کہ کتابی شکل دینا ممکن ہی نہیں تھا، اس لیے کہ جو اسباب میسر تھے، ان پر لکھے ہوئے قرآن کو کتابی شکل نہیں دی جا سکتی تھی۔ نبی کریم کے عہد میں بس یہی چیزیں میسر تھیں، انھی پر قرآن لکھا گیا، اس لیے کسی صورت جمع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

حالاں کہ رق، سفید صفحہ نما نرم اور پتلی کھال جس پر عرب لکھتے تھے، کھال کو نرم اور ملائم بنا کر اسی مقصد سے تیار کیا جاتا تھا۔ اہل لغت اس کے یہ معنی بتاتے وقت لکھتے ہیں: ’جِلْدٌ رَقِيقٌ يُكْتَبُ فِيهِ‘، یعنی وہ پتلی کھال جس میں لکھا جاتا تھا۔ روایت تراشنے والے نے اس ڈر سے کہ اس کی بات رد نہ ہو، ’رقاع‘ کا ذکر بھی کیا ہے، جس کے معنی کاغذ یا چمڑے کے ٹکڑے کے ہیں، جن پر لکھا جاتا تھا، لیکن اس نے اس کا ذکر بس ایسے کیا ہے کہ یہ بھی استعمال ہوا تھا۔ وہ اس سے بچنا چاہتا کہ یہ تاثر قائم نہ ہو کہ پورا قرآن رقاع پر لکھا گیا تھا۔ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ رقاع یا رق کو سی کر کتاب کی شکل دینا ممکن تھا۔ تو اگر وہ کھال کے ساتھ پتھروں اور کھجور کی چھال وغیرہ کا ذکر نہ کرتا تو ڈھونڈنے، ترتیب دینے اور جمع کرنے کا مقدمہ ہی قائم نہیں ہونا تھا۔ پھر یہ سوال سامنے کا تھا کہ جب لکھا ہی چمڑے پر گیا تھا تو سلائی سے کتابی شکل ہی تو دینا تھی۔ تو کیا زید بن ثابت کی جوانی اور تہمت سے براءت صرف سلائی کے لیے استعمال ہونی تھی!

۱۰۔ یہ جملہ تو قیامت خیز ہے۔ راوی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت زید نے کہا: ’حَتَّى وَجَدْتُ مِنْ سُورَةِ التَّوْبَةِ آيَتَيْنِ مَعَ خُزَيْمَةَ الْأَنْصَارِيِّ لَمْ أَجِدْهُمَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ، إِلَى آخِرِهِمَا‘۔ سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں ’لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ‘ سے آخر تک خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس سے ملیں۔ گویا یہ دو آیات بس ایک ہی شخص کے پاس ملیں، یعنی اگر حضرت خزیمہ زندہ نہ ہوتے تو قرآن ان دو آیات سے تو آج محروم ہوتا (العیاذ باللہ)۔ مطلب یہ کہ میری تلاش کی مشکل کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہو کہ ایک ایک آیت تلاش کرنے میں، میں نے کتنی جدوجہد

کی ہو گی، اور قرآن کے ضائع ہو جانے کے خطرے کی سنگینی کا اندازہ بھی تم لگا سکتے کہ ان دو آیات کی حفاظت تو بس ایک آدمی پر منحصر تھی۔ یہ جملہ ایک کنایہ ہے، اس بات سے بھی کہ نہ جانے کتنی آیات اب قرآن میں نہیں ہیں جو سورۂ توبہ کی ان آیات کی طرح صرف ایک ایک صحابی کے پاس تھیں، اور ایک گواہی کی وجہ سے قبول نہیں کی گئیں۔ اسی طرح کتنی ہی آیات تھیں جو ان صحابہ کے ساتھ ہی قبر میں چلی گئیں جو جنگ یمامہ میں جام شہادت نوش فرما گئے۔ وہ نہ جانے کتنی آیات اپنے سینوں میں ساتھ لے گئے۔ نہ رسول نے اس کی فکر کی اور نہ اللہ تعالیٰ نے وعدۂ حفاظت کے باوجود حفاظ کی حفاظت کی۔

۱۱۔ یہ بھی تقدیر الٰہی کا معجزہ ہے کہ سورۂ توبہ کی دو آیات ایسے صحابی سے ملیں جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذوالشہادتین قرار دے چکے تھے، ورنہ یہ دو آیات ان کے پاس ہونے کے باوجود مصحف میں شامل نہ ہوتیں، اس لیے کہ اس روایت کے بقول دو صحابہ کی گواہی پر ہر آیت کو قرآن میں لکھا جا رہا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جمع قرآن کن مخدوش حالات میں ہوا ہے۔

۱۲۔ یہ جملہ یہ تاثر بھی دلوں میں پیدا کرتا ہے کہ قرآن عہد صحابہ میں خبر واحد ہی تھا، حضرت ابو بکر اور بالخصوص حضرت عثمان کے جمع کردہ نسخے بعد میں حدیث مشہور کا سا مقام حاصل کر گئے، کیونکہ آیات تمام صحابہ کے اجماع سے نہیں، بلکہ صرف دو دو صحابہ کی گواہی پر جمع کی گئیں۔

۱۳۔ پوری روایت کو از سر نو دیکھیے تو آپ کو اچنبھا ہو گا کہ تین صحابہ جمع قرآن کے مسئلے کو یوں سنبھال رہے ہیں کہ تینوں میں سے ایک بھی حافظ نہیں ہے کہ تینوں مل کر آرام سے قرآن لکھ لیں، جب کہ متعدد حوالوں سے ثابت ہے کہ یہ تینوں حافظ قرآن تھے۔

۱۴۔ تینوں یوں اس مسئلے سے نبرد آزما ہیں کہ باقی ساری امت کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ شاید ان ستر شہید حفاظ کے سوا باقی قرآن سے واقف بھی نہیں کہ ان سے مدد لی جا سکے۔ فرض کر لیجیے کہ واقعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو منتشر چھوڑا تھا تو پھر بھی، مثلاً کسی دن مسجد نبوی میں، جمعہ کے دن ابو بکر صدیق اعلان کرتے کہ ہم قرآن کو جمع کرنا چاہتے ہیں، سب زید بن ثابت کی مدد کریں۔ تو نہ ان کو پہاڑ جیسا کام کرنے کی زحمت اٹھانا پڑتی اور نہ شاید سورۂ توبہ کی آخری دو آیات کے لیے صرف حضرت خزیمہ پر انحصار کرنا پڑتا، لیکن یہ تینوں مل کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خفیہ کام کرنے لگے ہیں، جس کی انھیں اجازت نہیں ہے۔

۱۵۔ اسی روایت میں حضرت عمر فرما رہے ہیں کہ دیگر حفاظ کے مختلف جنگوں میں مارے جانے کا امکان ہے،

اس لیے ان کے دنیا سے جانے سے پہلے پہلے قرآن جمع کر لیا جائے، مگر جب اس روایت میں قرآن جمع کرنے کا معاملہ عمل میں لایا جاتا ہے، اس اندوہ ناک انجام پر جمع قرآن کا عمل اختتام پذیر ہوتا ہے کہ ایک ہی صحابی دو آیات فراہم کرتے ہیں، دیگر حفاظ دکھائی نہیں دیتے۔

۱۶۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ 'وَكَانَتِ الصُّحُفُ الَّتِي جُمِعَ فِيهَا الْقُرْآنُ عِنْدَ أَبِي بَكْرٍ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ، ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ، ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ'۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید بن ثابت کا جمع کردہ یہ نسخہ اتنے برس تک ان تین گھروں میں رہا تو باقی امت کے پاس کیا تھا؟ کیا وہ اس عرصہ میں پورے قرآن سے محروم رہے تھے؟ گویا جنگ یمامہ والی صورت حال تا حال چلی آ رہی تھی کہ جس کو جتنا یاد ہے، بس وہی اس کے پاس ہے۔ کسی کو یہ تمنا نہیں تھی کہ وہ پورا قرآن جانے، یاد کرے یا اسے سمجھے؟

۱۷۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبین وحی سے لکھوایا تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ یہ روایت یہ وسوسہ ڈالتی ہے کہ پورا نہیں لکھوایا گیا تھا، تبھی تو موجود نہیں تھا یا یہ کہتی ہے کہ لکھوایا تو پورا گیا تھا، مگر پھر محفوظ نہیں رکھا گیا! یعنی یا نہ قرآن پورا لکھوایا گیا یا جو لکھوایا گیا، اسے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ تو پھر اس لکھوانے کا مقصد ہی کیا تھا! اگر دونوں میں کوئی بھی صورت ہو تو یہ روایت الزام دھرتی ہے کہ کاتبین وحی کا تقرر محض ایک کھیل ہی تھا (نعوذ باللہ)، چالیس کاتبین وحی کا محض وقت ضائع کیا گیا۔ جس کام پر اتنے لوگوں کی محنت لگی، اس کی قدر بھی نہیں کی گئی اور سب کیا ہوا کام ضائع کر دیا گیا، بلکہ حضرت زید پر بھی تہمت آتی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر کیا لکھا نہیں کرتے تھے؟

۱۸۔ اس روایت نے تو بہت سی باتوں اور حقیقتوں کو مشکوک بنا دیا ہے۔ صحابہ کی تہجدیں کیا ہوئیں؟ تراویح کیا ہوئی؟ حفاظ کی اتنی کثرت جو بتائی جاتی ہے، وہ کیا ہوئی؟ کاتبین وحی کا تقرر کیا ہوا؟ قرآن مجید کی حفاظت کا وعدۂ الٰہی کیا ہوا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا 'لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ' (النحل ۱۶: ۴۴) اور 'بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ' (المائدہ ۵: ۶۷) احکام کی تعمیل کیا ہوئی؟

یہ وہ ڈیڑھ درجن فتنہ پرور امور ہیں جن کا یہ روایت دلوں میں وسوسہ ڈالتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ روایت پسند لوگ جو اس روایت کی وجہ سے قرآن کو اسی طرح سے تلاش کیا ہوا مانتے ہیں، ان کے لیے یہ نکات تعجب، حیرت اور کسی پریشانی کا باعث نہیں ہوں گے، لیکن اس کے برعکس، جن لوگوں کا امت کے اس تواتر کہ

قرآن عہد نبوی سے تاحال محفوظ ہے اور قرآن کے وعدۂ حفاظت پر اعتماد ہے، ان کے لیے عہد صحابہ کا یہ منظر کسی طرح قابل قبول نہیں ہو گا۔ یہ روایت نہ صرف یہ کہ قرآن اور امت کے تواتر کے خلاف ہے، بلکہ خود دیگر روایات کے بھی خلاف ہے۔ آگے ہم وہ روایات پیش کریں گے، جو اس روایت کے قائم کردہ تاثرات کا ازالہ کرتی ہیں۔

[باقی]

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۳۳)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

عہد علوی

مسلمانوں سے قتال کرنے پر معذرت

۳۶ھ: حضرت عثمان کی شہادت کے وقت حضرت ابو موسیٰ اشعری گورنر کوفہ تھے۔ حضرت علی نے انھیں خط لکھ کر کوفہ کے مسلمانوں سے اپنی بیعت لینے اور جنگ میں شامل ہونے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا: میں نے آپ کی امارت اس لیے برقرار رکھی تھی کہ راہ حق میں میرے مددگار ہوں گے۔ حضرت ابو موسیٰ نے جواب دیا: اہل کوفہ سبھی آپ کے مطیع ہیں، اگرچہ کچھ لوگوں سے زبردستی بیعت لی گئی ہے۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے اپنی فوج مجتمع کی تو حضرت علی نے بھی اپنا لشکر تیار کرنا شروع کر دیا۔ مدینہ کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا: ان لوگوں کا مقابلہ کرنے چلو جو تمھاری جماعت میں تفریق پیدا کر رہے ہیں۔ اپنا لشکر لے کر حضرت علی فید کے مقام پر پہنچے تھے کہ کوفہ سے عامر بن مطر کی آمد ہوئی۔ اس نے بتایا: اگر آپ صلح کا ارادہ رکھتے ہیں تو ابو موسیٰ یہی چاہتے ہیں اور اگر آپ قتال کرنا چاہتے ہیں تو ابو موسیٰ ساتھ نہ دیں

گے۔ حضرت علی نے کہا: میں تو صرف اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ بصرہ پہنچنے پر حضرت علی کے قاصد محمد بن ابو بکر اور محمد بن عون حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس آئے اور جنگ کے لیے نکلنے کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کوفہ کے لوگوں سے کہا: اس جنگ میں پیچھے بیٹھ رہنا ہی آخرت کی راہ ہے، جب کہ جنگ کے لیے نکلنا دنیا کا راستہ ہو گا۔ دونوں محمد غصے میں آ گئے اور حضرت ابو موسیٰ کو برا بھلا کہا۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: عثمان کی بیعت کا قلادہ میری گردن میں ہے اور تمھارے صاحب علی کی گردن میں بھی۔ قتال اگر ضروری بھی ہے تو ہم تمام قاتلین عثمان سے نمٹنے کے بعد کسی سے جنگ کریں گے۔

فوج میں بھرتی ہونے سے منع کرنا

حضرت علی نے حضرت عمار بن یاسر کو اہل کوفہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ انھیں اپنی فوج میں بھرتی پر آمادہ کریں۔ تب حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت ابو مسعود انصاری ان سے ملنے آئے اور ان سے کہا: جب سے تم اسلام لائے ہو، میں نے اس سے زیادہ بری بات نہیں دیکھی کہ تم قتال میں جلد بازی دکھا رہے ہو۔ حضرت عمار نے فوراً جواب دیا: جب سے تم مسلمان ہوئے ہو، میں نے اس سے زیادہ بری بات نہیں دیکھی کہ تم جہاد کرنے میں سستی کر رہے ہو۔ حضرت ابو مسعود انصاری نے حضرت عمار اور حضرت ابو موسیٰ کو ایک نیا جوڑا پہنایا، پھر تینوں مسجد تشریف لے گئے (بخاری، رقم ۷۱۰۲)۔

حضرت علی کی بار بار کوشش

حضرت علی نے اب اشتر سے کہا: تم اور عبد اللہ بن عباس جاؤ اور معاملہ سلجھاؤ۔ دونوں اصحاب حضرت ابو موسیٰ سے ملے اور کوفہ کے لوگوں کی مدد چاہی۔ حضرت ابو موسیٰ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا: بلاشبہ، اصحاب رسول جو مختلف مقامات میں آپ کے ساتھ رہے اللہ و رسول کے احکام کو ان لوگوں سے بہتر جانتے ہیں جو آپ کی صحبت میں نہیں رہے۔ تمھارا ہم پر حق ہے جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تمھارے پاس خلافت کا دعویٰ لے کر جو شخص مدینہ سے آئے، اسے لوٹا دو تاوقتیکہ تمام اہل مدینہ ایک امر پر متفق نہ ہو جائیں۔ اس جنگ میں شامل ہو کر تکلیف نہ اٹھاؤ، کیونکہ یہ ایک خاموش فتنہ ہے، جس میں سویا ہوا بیدار رہنے والے سے، بیدار بیٹھ رہنے والے سے، بیٹھ رہنے والا کھڑے سے اور کھڑا رہنے والا سوار سے بہتر ہے۔ تلواروں کو میان میں کر لو، نیزوں کے پھل اتار دو اور کمانوں کی تانت کاٹ ڈالو۔ گھروں سے چپکے رہو اور ابن آدم ہابیل کی طرح ہو جاؤ (ترمذی، رقم ۲۲۰۴۔ مسند احمد، رقم ۱۹۷۳۰)۔ مظلوم اور ستم رسیدہ کو پناہ دو، حتیٰ کہ خلافت کے معاملے پر اتفاق ہو جائے اور یہ فتنہ ٹل جائے۔ حضرت ابو موسیٰ نے حضرت علی کے انتخاب کو جائز تسلیم کیا، تاہم اہل کوفہ کو اس

خانہ جنگی میں غیر جانب دار رہنے کی تلقین کی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس نے حضرت علی کو حضرت ابو موسیٰ کے جواب سے آگاہ کیا تو انھوں نے سلجھاؤ کے لیے حضرت حسن اور حضرت عمار بن یاسر کو بھیجا۔ دونوں کوفہ کی مسجد میں پہنچے، حضرت ابو موسیٰ حضرت حسن سے گلے ملے اور حضرت عمار سے مخاطب ہوئے: آپ نے اور لوگوں کے ساتھ مل کر امیر المومنین عثمان سے دشمنی کی اور فاجروں میں شامل ہو گئے۔ اب حضرت حسن بولے: ابو موسیٰ، آپ لوگوں کو ہماری مدد سے کیوں روک رہے ہیں؟ ہمارا ارادہ تو لوگوں کی اصلاح کرنا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ بولے: میرے ماں باپ آپ پر قربان، جس سے مشورہ کیا جاتا ہے، امین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو بھائی بھائی بنایا ہے اور ہمارے مال اور جانیں ایک دوسرے پر حرام کی ہیں۔ اللہ فرماتا ہے: 'وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا'، ''جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ کا غضب اور لعنت اس پر نازل ہوتی رہے گی اور اللہ نے اس کے لیے زبردست عذاب تیار کر رکھا ہے'' (النساء ۴: ۹۳)۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی سن رکھا ہے: ''جلد ایک فتنہ برپا ہو گا، جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو گا، کھڑا ہونے والا پیدل چلنے والے سے بہتر ہو گا اور پیدل چلنے والا سوار سے بہتر ہو گا'' (ابوداؤد، رقم ۴۲۵۹۔ ترمذی، رقم ۲۱۹۴)۔ یہ سن کر حضرت عمار غصے میں آ گئے اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم خاص تمھارے لیے ہی دیا ہو گا۔ مجمع میں شور برپا ہو گیا تو حضرت ابو موسیٰ نے لوگوں کو خاموش کرایا، منبر پر بیٹھے اور دوبارہ خطاب کر کے اپنا موقف دہرایا۔

عبد خیر خیوانی نے حضرت ابو موسیٰ سے پوچھا: جب آپ اسے فتنہ قرار دیتے ہیں تو آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ اس فتنہ سے محفوظ کون رہے گا۔ اس وقت مسلمان چار جماعتوں میں منقسم ہیں۔ حضرت علی کوفہ میں، حضرات طلحہ و زبیر بصرہ میں، حضرت معاویہ شام میں برسرپیکار ہیں اور چوتھی جماعت حجاز میں ہے، جنگ کر کے مال غنیمت بٹور رہی ہے نہ کوئی دشمن اس سے قتال کر رہا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے جواب دیا: یہی لوگ سب سے بہتر ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ کی معزولی

حضرت ابو موسیٰ کوفہ کی جامع مسجد میں کھڑے ہو کر لوگوں کو جنگ میں شامل ہونے سے منع کر رہے تھے اور حضرت عمار ان سے تکرار کر رہے تھے کہ حضرت حسن نے انھیں منبر سے اترنے کو کہا۔ اس اثنا میں

حضرت ابو موسیٰ کے غلام چلاتے ہوئے آئے کہ اشتر محل میں داخل ہو گیا ہے اور اس نے ہمیں مار پیٹ کر نکال دیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ محل پہنچے تو اشتر نے گالی گلوچ کی اور انھیں بھی نکل جانے کو کہا۔ لوگ حضرت ابو موسیٰ کا سامان لوٹ رہے تھے، اشتر نے انھیں روکا۔ اس نے حضرت ابو موسیٰ کو شام تک کی مہلت دی اور محل میں رات گزارنے سے منع کر دیا۔ حضرت علی نے حضرت قرظہ بن کعب کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

حضرت ابو موسیٰ کے جانے کے بعد نو یا بارہ ہزار مسلمان دجلہ اور خشکی کے راستے کوفہ سے نکلے اور ذی قار کے مقام پر پہنچ کر حضرت علی کی فوج میں شامل ہوئے۔

جنگ صفین میں واضح شکست سے بچنا

۳۷ھ: جنگ صفین میں حضرت عمرو بن العاص کو شکست و ہلاکت نظر آنے لگی تو حضرت معاویہ سے کہا: میں آپ کو ایسا مشورہ دیتا ہوں جس سے ہماری جمعیت مضبوط ہو جائے گی اور جیش علی کا انتشار بڑھ جائے گا۔ ہم قرآن بلند کر کے نعرہ لگائیں کہ قرآن ہمارے مابین جو فیصلہ کرے گا، ہم قبول کر لیں گے۔ اس پر ان میں اختلاف رونما ہو جائے گا اور اگر انھوں نے متفق ہو کر ہماری پیشکش قبول کر لی تو جنگ ٹل جائے گی۔ چنانچہ جب جنگ زوروں پر تھی اور اہل شام ایک ٹیلے کی پناہ لیے ہوئے تھے، حضرت معاویہ نے ایک شخص کو مصحف دے کر حضرت علی کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا: ہمارے درمیان اللہ کی کتاب حکم ہے۔ ادھر میدان جنگ میں شامیوں نے نیزوں پر قرآن بلند کیے تو کچھ لوگ بول اٹھے: ہم کتاب اللہ کو قبول کرتے ہیں۔ حضرت علی نے کہا: بندگان خدا، اپنا حق نہ چھوڑو، سچائی پر قائم رہو اور دشمن سے جنگ جاری رکھو۔ انھوں نے قرآن ایک چال کے طور پر، دھوکا دینے کے لیے بلند کیے ہیں۔ حضرت علی کے کچھ ساتھیوں نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کتاب اللہ کی طرف بلائے اور ہم انکار کر دیں۔ مسعر بن فدکی، زید بن حصین اور کچھ دوسرے لوگوں نے جو بعد میں خارجی بن گئے، حضرت علی کو دھمکی دی کہ کتاب اللہ کی دعوت کو قبول کر لیں، ورنہ ہم آپ کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو عفان کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ حضرت علی نے کہا: اگر میری اطاعت کرنا چاہتے ہو تو جنگ جاری رکھو۔ خارجیوں نے جواب دیا: یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، آپ آدمی بھیج کر اشتر کو محاذ سے واپس بلا لیں۔ اشتر بہت جز بز ہوا اور کہا: جب قرآن اٹھائے گئے تھے، میں سمجھ گیا تھا کہ اب نیا اختلاف اور نئی فرقہ بندی جنم لے گی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ کی مدد سے ہمیں فتح مل رہی ہے اور ان لوگوں کا انجام برا ہونے والا ہے۔ مجھے گھوڑا دوڑانے کی مہلت دو، مجھ میں فتح کی حرص پیدا ہو گئی ہے، لیکن سب بولے: ہم نے اپنے اور ان کے بیچ

قرآن کو فیصل مان لیا ہے۔

قرآن کو حکم بنانا

صلح ہو جانے کے بعد حضرت اشعث بن قیس حضرت علی کے مشورے سے حضرت معاویہ سے ملے تو انھوں نے کہا: کتاب اللہ کے فرمان کے مطابق ایک آدمی آپ مقرر کر دیں اور ایک کا تعین ہم کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں کتاب اللہ کے حکم کے عین مطابق نزاع کا فیصلہ کریں، جسے فریقین من و عن قبول کر لیں۔ حضرت اشعث ہاں کہہ کر حضرت علی کے پاس آئے تو وہ بھی رضامند ہو گئے۔ اہل شام نے حضرت عمرو بن العاص کا نام تجویز کیا۔ حضرت اشعث اور اس گروہ نے جس نے بعد میں خوارج کا نام پایا حضرت ابو موسیٰ اشعری کا نام پیش کیا۔ حضرت علی بولے: تم نے پہلے میری بات نہیں مانی، اب تو نافرمانی نہ کرو۔ میں ابو موسیٰ کو یہ ذمہ داری نہیں دینا چاہتا۔ حضرت اشعث، زید بن حصین اور مسعر بن فدکی نے کہا: ہم ابو موسیٰ کے علاوہ کسی پر راضی نہ ہوں گے، کیونکہ انھوں نے ہمیں ان جنگوں میں پڑنے سے خبردار کیا تھا۔ حضرت علی نے کہا: مجھے ان پر اعتماد نہیں، انھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور لوگوں کو بہکا کر بھاگ گئے۔ میں تو یہ ذمہ داری ابن عباس کو دینا چاہتا ہوں۔ خارجیوں نے کہا: ابن عباس کا حکم بننا ایسا ہی ہے، جیسے آپ خود حکم بن جائیں۔ ہم ایسا آدمی چاہتے ہیں جس کا آپ سے اور معاویہ سے ایک سا تعلق ہو۔ حضرت علی نے اشتر کا نام لیا تو کہنے لگے: اسی نے تو اس سرزمین میں آگ لگا دی ہے۔ حضرت علی نے پوچھا: تو تم ابو موسیٰ کے علاوہ کسی کو نہ مانو گے؟ ان کے ہاں کہنے پر فرمایا: جو جی میں آئے کرو۔ حضرت ابو موسیٰ جنگ سے الگ تھلگ وادی عرض میں مقیم تھے۔ اطلاع ملنے پر لشکر گاہ میں چلے آئے۔ حضرت احنف بن قیس نے کہا: تم انھی کو چاہتے ہو تو ان کی پشت کئی مردوں کے ساتھ مضبوط کر دو۔ حضرت علی نے حکم بنائے گئے دونوں اصحاب سے کہا: اگر تم کتاب اللہ کے موافق فیصلہ نہ کرو گے یا کسی کی رو رعایت کرو گے تو تمھارا فیصلہ قبول نہ ہو گا۔

معاہدۂ تحکیم

بدھ ۱۳/ صفر ۳۷ھ (۳۱/ جولائی ۶۵۷ء) حضرت عمرو بن العاص حضرت علی کے پاس معاہدہ تحریر کرنے آئے۔ بسملہ کے بعد لکھا گیا: اہل کوفہ کی طرف سے علی اور اہل شام کی طرف سے معاویہ باہم معاہدہ کرتے ہیں۔ ہم اللہ کے حکم اور اس کی کتاب کو مانیں گے، فاتحہ سے خاتمہ تک۔ عبد اللہ بن قیس (ابو موسیٰ) اور عمرو بن العاص، دونوں حکم کتاب اللہ میں جو پائیں گے، اس پر عمل کریں گے اور جو کتاب میں موجود نہ ہوا، سنت عادلہ

سے اس کی رہنمائی لیں گے جو انصاف پر مبنی ہے اور تفرقہ سے بچاتی ہے۔ ان کا فیصلہ امت کو اختلاف اور جنگ سے نکالے گا، ہر مسلمان ان سے تعاون کرے گا اور ان کے معاہدے پر عمل کرنے کا پابند ہو گا۔ سب لوگ ہتھیار اتار دیں گے اور مامون ہوں گے۔ اس فیصلہ کی مدت رمضان تک ہو گی۔ حکمین نے فریقین سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان کی امان بھی طلب کی۔ حضرت اشعث بن قیس، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت سعید بن قیس، حضرت حجر بن عدی، اور حضرت مالک بن کعب حضرت علی کے اور حضرت ابواعور، حضرت حبیب بن مسلمہ، حضرت عتبہ بن ابوسفیان، وائل بن علقمہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن خالد حضرت معاویہ کے گواہوں میں شامل تھے۔ اشتر نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ طے ہوا کہ ماہ رمضان میں حضرت علی، دونوں ثالثوں سے اذرح یا دومۃ الجندل میں ملیں گے۔ حضرت علی نے کہا: صلح سے ہماری قوت جاتی رہی ہے، البتہ اقرار صلح کے بعد اس سے پھرنا ہرگز مناسب نہیں۔

حکمین کا اجتماع

۳۷ھ (۶۵۷ء): ماہ رمضان میں حکمین کا اجتماع طے تھا۔ حضرت علی نے چار سو افراد پر مشتمل وفد بھیجا جس میں شریح بن ہانی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوموسیٰ اشعری شامل تھے۔ حضرت معاویہ کی طرف سے بھی چار سو کا وفد حضرت عمرو بن العاص کی سربراہی میں پہنچا۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت مغیرہ بن شعبہ بھی ساتھ آئے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے حضرت عمرو بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ملنے کے بعد پیشین گوئی کی کہ ثالث کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکیں گے۔ ثالث مل بیٹھے تو حضرت عمرو بن العاص نے ابتدا کرتے ہوئے حضرت ابوموسیٰ سے پوچھا: کیا عثمان کو مظلومانہ طور پر شہید نہیں کیا گیا؟ حضرت ابوموسیٰ بولے: ہاں۔ اگلا سوال تھا: کیا معاویہ اور ان کی اولاد عثمان کے وارث نہیں؟ حضرت ابوموسیٰ بولے: کیوں نہیں۔ اب حضرت عمرو بن العاص نے کہا: اللہ کا فرمان ہے: 'وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا'، ''اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو، اس کے ولی کو ہم نے قصاص کا حق دیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳)۔ لہٰذا اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ معاویہ کو عثمان کا جانشین بنا دیا جائے، وہ سیاست اور کاروبار مملکت کو خوب سمجھتے ہیں، ام المومنین ام حبیبہ کے بھائی ہیں اور کاتب وحی رہ چکے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ نے جواب دیا: میں یہ نہیں کر سکتا کہ معاویہ کو خلیفہ بنا دوں اور مہاجرین اولین کو چھوڑ دوں۔ شرف و

فضل کا مقابلہ کرنا ہو تو حضرت علی قریش کے بہترین شخص ہیں۔ حضرت عمرو نے کہا: آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں، اس لیے خود ہی کوئی حل تجویز کر دیں۔ حضرت ابو موسیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عمرو نے اپنے بیٹے عبداللہ کا نام تجویز کیا۔ حضرت عمرو نے حضرت عبداللہ بن عمر کو مال کثیر کے عوض خلافت سے دست بردار ہونے کی پیشکش کی تو وہ غصے میں آ گئے اور کہا: میں رشوت لینے کو تیار نہیں ہوں۔ حضرت عمرو اور حضرت ابو موسیٰ نے ایک دوسرے کے متبادل نام رد کر دیے تو حضرت ابو موسیٰ بولے: علی اور معاویہ، دونوں خلافت چھوڑ دیں اور مسلمان باہمی مشورے سے نیا خلیفہ چن لیں۔ یہ جواب حضرت عمرو کی خواہش کے عین مطابق تھا، اس لیے فوراً گوگوں کو اکٹھا کر لیا اور حضرت ابو موسیٰ کو آگے کھڑا کر دیا۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ہم بالاتفاق علی و معاویہ، دونوں کو معزول کرتے ہیں، آپ خود اہل شخص کو خلیفہ چن لیں۔ اب حضرت عمرو بڑھے اور اعلان کیا: میں نے بھی ان کے خلیفہ کو ہٹایا، تاہم اپنے خلیفہ معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں، کیونکہ وہ عثمان کے ولی ہیں اور ان کا قصاص طلب کر رہے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ نے حضرت عمرو سے شکوہ کیا کہ ہمارا اتفاق علی و معاویہ، دونوں کو معزول کرنے پر ہوا تھا، آپ نے اس کے برعکس اعلان کر کے دھوکا کیا ہے۔ حضرت ابن عباس بولے: ابو موسیٰ، قصور آپ کا نہیں، ان لوگوں کا ہے جنھوں نے آپ کو حکم بنایا۔ حضرت عمرو شام کو لوٹ گئے اور حضرت ابو موسیٰ نے شامیوں کے خوف سے مکہ کی راہ لی۔ حضرت ابو موسیٰ کہا کرتے تھے: مجھے ابن عباس نے عمرو کے فریب سے آگاہ کیا تھا، لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ امت کی خیر خواہی پر کسی شے کو ترجیح نہ دیں گے۔

غالی شیعہ حضرت ابو موسیٰ سے بغض رکھتے ہیں، کیونکہ وہ حضرت علی کی فوج میں شامل نہیں ہوئے اور تحکیم کے وقت انھوں نے حضرت علی و حضرت معاویہ، دونوں کو معزول کیا اور حضرت عبداللہ بن عمر کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا۔

تحکیم کی ناکامی کے بعد

۴۰ھ (۶۶۰ء) حضرت معاویہ کے کمانڈر بسر بن ارطاۃ نے مدینہ پر چڑھائی کی اور وہاں کے گھروں کو مسمار کیا تو حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابو ایوب انصاری شہر نبی سے نکل آئے، بسر نے اس کے بعد مکہ کا رخ کیا تو حضرت ابو موسیٰ جان بچانے کے لیے یمن چلے آئے، پھر ان کو وہاں کے علوی عامل حضرت عبیداللہ بن عباس سے اندیشہ ہوا تو کوفہ لوٹ آئے۔ جنگ صفین کے بعد انھوں نے ملکی سیاست میں کوئی حصہ نہ لیا، کوفہ میں مقیم رہے جہاں انھوں نے مسجد کے پاس گھر بنایا اور اسی میں وفات پائی۔

عہد معاویہ کی متضاد روایات

حضرت معاویہ حضرت ابو موسیٰ کو شام کا گورنر بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے حضرت ابو موسیٰ کو اپنے ہاتھ سے خط لکھا کہ عمرو بن العاص کی طرح میری بیعت کر لو، میں تمھارے ایک بیٹے کو بصرہ، دوسرے کو کوفہ کا عامل بنا دوں گا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور خط لکھا: میں اس پیشکش کو قبول کر کے اپنے رب کو کیا جواب دوں گا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے حضرت معاویہ کی بیعت کر لی اور حضرت معاویہ نے ان کو پانچ سال کے روکے ہوئے وظائف دے دیے۔ ایک بار حضرت ابو موسیٰ اشعری حضرت معاویہ سے ملنے گئے، ان کے سر پر سیاہ عربی ٹوپی تھی۔ انھوں نے یا امین اللہ، کہہ کر حضرت معاویہ کو سلام کیا۔ رخصت ہوئے تو حضرت معاویہ نے کہا: بڈھا اس لیے آیا تھا کہ میں اسے کوئی منصب دے دوں، واللہ، میں ہرگز ایسا کرنے والا نہیں۔

وفات

حضرت ابو موسیٰ اشعری نے ۵۲ھ (۴۲ھ، ۴۴ھ، ۵۰ھ یا ۵۵ھ) میں کوفہ سے دو میل دور واقع ثوِیّہ کے مقام پر یا مکہ میں وفات پائی۔ ان کی عمر ستر برس سے اوپر ہوئی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی وفات کا وقت آیا تو اپنے بیٹوں کو بلا کر وصیت کی: جب میں مروں تو میری وجہ سے کسی کو تکلیف مت دینا، میرا جنازہ لے کر جلدی جلدی چلنا، رونا دھونا نہ دھونی دینا (ابن ماجہ، رقم ۱۴۸۷)۔ میری قبر گہری کھودنا، اس پر پختہ تعمیر نہ کرنا۔ ان پر غشی طاری ہوئی تو ان کی بیوی حضرت ام عبد اللہ واویلا کرنے لگیں، کچھ افاقہ ہوا تو وہ بولے: کیا تم نے رسول اللہ کا ارشاد نہیں سن رکھا؟ انھوں نے ہاں کہا، پھر خاموش ہو گئیں۔ آپ کا فرمان ہے: وہ ہم میں سے نہیں، جس نے سر منڈایا، اول فول بکا یا کپڑے پھاڑے (ابوداؤد، رقم ۳۱۳۰۔ نسائی، رقم ۱۸۶۴۔ ابن ماجہ، رقم ۱۵۸۶۔ احمد، رقم ۱۹۵۴۷)۔ بیوی کو وصیت کی: مجھے قمیص سمیت غسل دینا، بعد میں قمیص کو اتار دینا یا کاٹ دینا۔ حضرت ابو موسیٰ کو شدید درد ہوا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کا سر گھر کی ایک خاتون (ان کی اہلیہ صفیہ بنت دمون یا ابو دومہ) کی گود میں تھا، ذرا ہوش میں آئے تو کہا: میں ہر اس چیز سے بری الذمہ ہوں جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار براءت کیا۔ آپ چیخنے والی، بال مونڈنے والی اور گریبان پھاڑنے والی ماتم کناں سے بے زار تھے (بخاری، رقم ۱۲۹۶۔ مسلم، رقم ۲۸۷۔ احمد، رقم ۱۹۵۳۵)۔

[باقی]

کوکب شہزاد

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے پہلی وحی کا تجربہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

ہمارے بچپن میں ہمیں یہی بتایا جاتا تھا اور اپنی نصاب کی کتابوں میں بھی ہم نے یہی پڑھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں جاتے تھے اور وہاں کئی کئی دن غور کرتے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کیسے کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے سخت بے زار تھے کہ ان کی قوم بتوں کی عبادت کرتی تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لا شریک نہیں مانتے تھے۔ انھوں نے خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ ہر ایک بت اپنے قبیلے کی نمایندگی کرتا تھا۔ عربوں نے فرشتوں کی مورتیاں بنا کر خانۂ کعبہ میں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور ہم اگر ان کی عبادت کریں گے تو یہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سفارش کریں گی۔

ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تشریف فرما تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لائے اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر بولے 'اِقْرَأْ'۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بولے: 'ما أنا بقارئ'۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے دو تین دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کو دبایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے لگ گئے۔ جب حضرت جبریل واپس چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے تو کہنے لگے: 'زملونی، زملونی' (مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو)۔ حضرت خدیجہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چادر اوڑھا دی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ سے فرمانے لگے کہ مجھے جان کا اندیشہ ہے اور پورا واقعہ حضرت خدیجہ کو بتایا۔

حضرت خدیجہ نے جب پورا واقعہ سنا تو فرمانے لگیں کہ آپ بہترین انسان ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، یتیموں کا آسرا ہیں، بیماروں کی عیادت فرماتے ہیں، صادق اور امین ہیں۔ آپ کا رب آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ حضرت خدیجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کسی قریبی رشتہ دار، جن کا نام ورقہ بن نوفل تھا، کے پاس لے گئیں۔ جب ورقہ بن نوفل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور کچھ سوال وجواب کیے تو حضرت خدیجہ سے کہنے لگے کہ یہ وہی ناموس ہے جس کا ذکر تورات میں ہے۔ یہ آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کاش، میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم آپ کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دے گی۔

اس کے علاوہ صحیح بخاری میں ہے کہ:

عن عروة بن الزبير عن عائشة أم المؤمنين أنها قالت: أول ما بدئ به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصالحة في النوم فكان لا يرى رؤيًا إلا جاءت مثل فلق الصبح ثم حبب إليه الخلاء وكان يخلو بغار حراءٍ فيتحنث فيه وهو التعبد الليالي ذوات العدد قبل أن ينزع إلى أهله ويتزود لذلك ثم يرجع إلى خديجة فيتزود لمثلها حتى جاءه الحق وهو في غار حراءٍ فجاءه الملك فقال: اقرأ، قال: «ما أنا بقارئٍ» قال: «فأخذني فغطني حتي بلغ مني الجهد ثم أرسلني» فقال: اقرأ، قلت: «ما أنا بقارئٍ، فأخذني فغطني الثانية حتى بلغ مني الجهد ثم أرسلني» فقال: اقرأ، فقلت: «ما أنا بقارئٍ، فأخذني فغطني الثالثة ثم أرسلني»

”حضرت عروہ رضی اللہ عنہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا اچھے خواب سے ہوئی جو صبح کی روشنی کی طرح نمودار ہوتے۔ پھر آپ کے لیے تنہائی پسندیدہ بنا دی گئی۔ آپ غار حرا میں خلوت گزیں رہتے۔ وہاں وہ کئی کئی دن تحنث، یعنی عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد وہ اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹ جاتے۔ وہ اپنے ساتھ وہاں قیام کے لیے کھانے پینے کا سامان لے جاتے اور واپس اپنی اہلیہ کی طرف مزید کھانا لینے کے لیے لوٹتے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا، یہاں تک کہ حق آپ پر نازل ہوا، جب کہ آپ غار حرا میں تھے۔ چنانچہ فرشتہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے کہا: پڑھو، آپ نے جواب دیا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید کہا: فرشتے نے مجھ کو پکڑا اور اس زور سے بھینچا کہ میں برداشت نہ کر سکا۔ سو اس نے مجھے ڈھیلا چھوڑ دیا

فقال: ﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ﴾، فرجع بها رسول الله صلى الله عليه وسلم يرجف فؤاده فدخل على خديجة بنت خويلدٍ رضي الله عنها فقال: «زملوني، زملوني» فزملوه حتى ذهب عنه الروع فقال لخديجة وأخبرها الخبر: «لقد خشيت على نفسي» فقالت خديجة: كلا والله ما يخزيك الله أبدًا إنك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق فانطلقت به خديجة حتى أتت به ورقة بن نوفل بن أسد بن عبد العزى بن عم خديجة وكان امرأ تنصر في الجاهلية وكان يكتب الكتاب العبراني فيكتب من الإنجيل بالعبرانية ما شاء الله أن يكتب وكان شيخًا كبيرًا قد عمي فقالت له خديجة: يا بن عم، اسمع من بن أخيك، فقال له ورقة: يا بن أخي، ماذا ترى؟ فأخبره رسول الله صلى الله عليه وسلم خبر ما رأى، فقال له ورقة: هذا الناموس الذي نزل الله على موسى يا ليتني فيها جذعًا ليتني أكون حيًا إذ يخرجك

اور پھر کہا: پڑھو، میں نے جواب دیا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید کہا: فرشتے نے مجھ کو پکڑا اور اس زور سے بھینچا کہ میں برداشت نہ کر سکا تو اس نے مجھے ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر کہا: پڑھو، آپ نے جواب دیا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر فرشتے نے مجھ کو تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچا اور چھوڑ دیا اور پھر کہا: 'اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ'۔ اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر واپس آ گئے، جب کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ آپ خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور ان سے کہا: مجھے اوڑھا دو، مجھے اوڑھا دو تو انھوں نے آپ کو اوڑھا دیا۔ جب ان کا خوف دور ہوا تو آپ نے خدیجہ سے گفتگو کا آغاز کیا اور انھیں جو کچھ پیش آیا، اس سے ان کو باخبر کیا اور کہا: مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ اس پر خدیجہ نے جواب دیا: ہرگز نہیں، خدا کی قسم، وہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ قرابت مندوں کے حقوق کی پاس داری کرتے ہیں، کم زوروں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، محروموں کے لیے کماتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور لوگوں کی مشکلات میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ بعد ازاں حضرت خدیجہ آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ کے پاس لے گئیں۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ نصرانی ہو گئے تھے۔ وہ

قومك، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «أو مخرجي هم»؟ قال: نعم، لم يأت رجلٌ قط بمثل ما جئت به إلا عودي وإن يدركني يومك أنصرك نصرًا مؤزرًا ثم لم ينشب ورقة أن توفي وفتر الوحي. (بخاری، رقم ۳)

عبرانی لکھنا جانتے تھے اور انجیل سے جو کچھ خدا چاہتا، لکھتے تھے۔ وہ اس وقت بہت عمر رسیدہ تھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ چنانچہ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا: ذرا سنیے، یہ آپ کے بھانجے کیا کہتے ہیں۔ سو ورقہ نے کہا: بھانجے، تم نے کیا دیکھا؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جو کچھ دیکھا تھا، اس سے باخبر کیا۔ ورقہ نے جواب میں کہا: یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا۔ کاش، میں ایک طاقت ور نوجوان ہوتا۔ کاش، میں اس وقت تک زندہ رہتا جب تمھاری قوم تم کو تمھارے شہر سے نکال دے گی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا وہ مجھے باہر نکال دیں گے؟ ورقہ نے جواب دیا: ہاں۔ جب بھی کوئی شخص وہ لے کر آیا جو تم لائے ہو، لوگ اس کے دشمن بن گئے ہیں۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں تمھاری خوب مدد کروں گا۔ پھر زیادہ دیر نہ گزری کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا اور وحی آپ کے پاس آنا بند ہو گئی۔''

جب ہم مندرجہ بالا روایت پر غور کرتے ہیں تو اس میں ہمیں کچھ سقم نظر آتے ہیں۔

۱۔ اس روایت کو سب سے پہلے حضرت عائشہ سے مدنی دور میں نبوت کے چودھویں، پندرھویں سال روایت کیا گیا، حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس حوالے سے حضرت خدیجہ یا ورقہ بن نوفل سے کوئی روایت نہیں ہے۔ پندرہ سولہ سال تک کسی کا اس کا ذکر نہ کرنا کیا معیوب بات نہیں؟

۲۔ نبوت کے ابتدائی دور میں جلیل القدر صحابۂ کرام موجود تھے۔ کسی نے اس بات کو نقل نہیں کیا کہ پہلی وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ گھبرا گئے۔

۳۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ روایت منقطع ہے۔اس کی لڑی سیدھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی
سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ یہ روایت قرآن مجید کی سورۂ نجم اور سورۂ تکویر کے خلاف ہے۔ سورۂ نجم میں ہے:

وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰى. مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ وَمَا غَوٰى. وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى. اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى. عَلَّمَهٗ شَدِيۡدُ الۡقُوٰى. ذُوۡ مِرَّةٍ ؕ فَاسۡتَوٰى. وَهُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰى. ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى. فَكَانَ قَابَ قَوۡسَيۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى. فَاَوۡحٰۤى اِلٰى عَبۡدِهٖ مَاۤ اَوۡحٰى. مَا كَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰى. اَفَتُمٰرُوۡنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى. وَلَقَدۡ رَاٰهُ نَزۡلَةً اُخۡرٰى. عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى. عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى. اِذۡ يَغۡشَى السِّدۡرَةَ مَا يَغۡشٰى. مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰى. لَقَدۡ رَاٰى مِنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِ الۡكُبۡرٰى. (۵۳: ۱-۱۸)

”تارے گواہی دیتے ہیں، جب وہ گرتے ہیں کہ تمھارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ (قرآن) تو ایک وحی ہے جو اُسے کی جاتی ہے۔ اُس کو ایک زبردست قوتوں والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحب کردار، بڑا صاحب حکمت ہے۔ چنانچہ وہ نمودار ہوا، اِس طرح کہ وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر قریب ہوا اور جھک پڑا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ جو کچھ اُس نے دیکھا، وہ دل کا وہم نہ تھا۔ اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو جو وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے؟ اور اُس نے ایک مرتبہ پھر اُسے سدرۃ المنتہٰی کے پاس اترتے دیکھا ہے، جس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے، جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ اُس کی نگاہ نہ بہکی، نہ بے قابو ہوئی۔ اُس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی ہیں۔“

سورۂ نجم کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر پہلی وحی کے نزول کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کیفیت تھی، اسے بیان کیا ہے کہ حضرت جبریل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ ان کی اصل شکل میں دیکھا۔ ’والنجم‘ میں ’و‘ قسم کا ہے، جو دعوے پر دلیل کے لیے آتا ہے، یعنی قرآن مجید کا بیان ہے کہ جب قرآن مجید کا نزول ہو رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے نزول کے تمام راستوں پر پہرے بہت شدید کر دیے تھے

تاکہ کوئی شیطان یا جن اس کے نزول میں مداخلت نہ کر سکے۔ جب کوئی شیطانی مخلوق آسمان کے قریب جاتی تو اسے ستارے اور شہاب ثاقب ٹوٹ کر پڑتے تھے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید ہر شر اور مداخلت سے پاک ہے اور اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے بڑا زبردست انتظام کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن مجید نے 'صَاحِبُکُمْ'[1] کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی اے قریش کے لوگو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری ہی قوم کے ایک فرد ہیں انھوں نے تمھارے اندر اپنا بچپن، لڑکپن، اور جوانی گزاری ہے اور تم انھیں ''صادق'' اور ''امین'' کے نام سے جانتے ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف ان کی اصلاح کے لیے کوئی نبی یا رسول بھیجتے ہیں تو وہ اس قوم کا ہی بہترین انسان ہوتا ہے۔ وہ قوم کے باہر کا بندہ نہیں ہوتا۔ اس کا بچپن اور جوانی اس قوم کے اندر ہی گزرا ہوتا ہے۔ ان کے ماحول اور روایات کا اسے پتا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے دوسری جگہوں پر ان کے لیے 'اَخَاھُمْ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جاوید احمد صاحب غامدی اس آیت کے بارے میں اپنی تفسیر ''البیان'' میں لکھتے ہیں۔ لفظ 'صاحبکم' کے بعد دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک 'ضَلَّ' اور دوسرا 'غَوٰی'۔ 'ضَلَّ' اس گم راہی کے لیے آتا ہے جب کوئی شخص راستہ نہ جاننے کی وجہ سے کسی غلط راستے پر چل پڑے اور 'غوی' کا تعلق اس گم راہی سے ہے جو انسان نفس کی اکساہٹ سے اور جان بوجھ کر اختیار کر لیتا ہے (۶۳/۵)۔

اس سے آگے کی آیات ہیں:

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی. اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی. عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی. ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ فَاسۡتَوٰی. وَھُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی. ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی. فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی. فَاَوۡحٰٓی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَآ اَوۡحٰی. مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی. اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی. وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی. عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَھٰی. عِنۡدَھَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی. اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی.

''وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ (قرآن) تو ایک وحی ہے جو اُسے کی جاتی ہے۔ اُس کو ایک زبردست قوتوں والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحب کردار، بڑا صاحب حکمت ہے۔ چنانچہ وہ نمودار ہوا، اِس طرح کہ وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر قریب ہوا اور جھک پڑا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔

۱۔ النجم ۵۳: ۲۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى. لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى.(النجم ۵۳: ۳-۱۸)

جو کچھ اُس نے دیکھا، وہ دل کا وہم نہ تھا۔ اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو جو وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے؟ اور اُس نے ایک مرتبہ پھر اُسے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا ہے، جس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے، جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ اُس کی نگاہ نہ بہکی، نہ بے قابو ہوئی۔ اُس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی ہیں۔“

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ یہ قرآن تو ایک وحی ہے جو انھیں کی جاتی ہے۔ اس کو ایک قوتوں والے، یعنی ”جبریل“ نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحب کردار اور بڑا صاحب حکمت ہے۔ چنانچہ جبریل پہلی وحی کے وقت اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر وہ (محمد) کے قریب ہوا اور جھک پڑا، یہاں تک کے دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔

مندرجہ بالا آیات میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت جبریل نبی کو وحی پہنچاتے ہوئے ان کے اس قدر قریب ہوئے کہ ان دونوں کے بیچ دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر دیکھا وہ ان کے دل کا وہم نہیں تھا۔ اور ایک مرتبہ اور بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا۔ اس کے پاس جنت الماوی ہے، جو کچھ سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ اس کی نگاہ نہ بہکی نہ بے قابو ہوئی۔ اس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی ہیں۔

ان آیات میں بڑے واضح طریقے سے بتایا گیا ہے کہ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت جبریل کو ان کی اصلی حالت میں دیکھا تو نہ آپ پریشان ہوئے، نہ گھبرائے، بلکہ پورے دل کے استحکام کے ساتھ حضرت جبریل سے ملے اور ان سے وحی وصول کی اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن جب ہم جب روایت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل کو دیکھ کر بہت گھبرائے اور اس کیفیت میں حضرت خدیجہ کے پاس آئے اور انھیں آ کر کہا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے اور وہ انھیں ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر گئیں۔

ان آیات میں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھتے، بلکہ ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی پر اعتماد اور یقین دل کے ساتھ حضرت جبریل کو ملتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ تکویر میں فرمایا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ. الْجَوَارِ الْكُنَّسِ. وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ. وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ. اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ. ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ. مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ. وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ. وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ. وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ. وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ. فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ. اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ. لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ. وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ.

(۸۱: ۱۵-۲۹)

”(یہ قرآن کی دعوت ہے، اِسے شیطانوں سے کیا تعلق)؟اِس لیے، نہیں، (یہ کسی شیطان کا الہام نہیں ہے)۔ میں اُن تاروں کو گواہی میں پیش کرتا ہوں جو پلٹتے، چلتے، (شیطانوں پر آگ برساتے، پھر) چھپ جاتے ہیں، اور رات کو جب وہ پیچھے ہٹتی اور صبح کو جب وہ (اُس کے بوجھ سے نکل کر) سانس لیتی ہے کہ بے شک، یہ ایک رسول کریم کا لایا ہوا کلام ہے، بہت صاحب قوت، عرش والے کے ہاں بہت بلند مرتبہ، اُس کا حکم وہاں مانا جاتا ہے اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ اور (قریش کے لوگو)، تمھارا ساتھی کوئی دیوانہ بھی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اِس رسول کریم کو بالکل کھلے افق پر دیکھا ہے۔ (تم جانتے ہو کہ) وہ غیب کی باتوں پر کبھی حریص نہیں رہا۔ (اس لیے ہرگز نہیں)، یہ کسی شیطان رجیم کا الہام نہیں ہے۔ سو تم کہاں کھوئے جاتے ہو؟ یہ تو دنیا والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے، تم میں سے اُن کے لیے جو سیدھی راہ چلنا چاہیں۔ اور تم نہیں چاہتے، مگر یہ کہ اللہ، عالم کا پروردگار ہی (اپنے قانون کے مطابق) چاہے۔“

اس سورہ میں بھی استدلال کا وہی طریقہ ہے جو سورۂ نجم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ہر شر اور ہر شریر مخلوق سے بچانے کے لیے قرآن مجید کے نزول کے راستوں پر پہرے انتہائی سخت کر دیے ہیں اور اس

بات کی تصدیق جن بھی کرتے ہیں، جنھوں نے مسجد جن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھاتے سنا کہ آج ہمیں معلوم ہوا کہ آسمان پر راستے اتنے شدید کیوں کر دیے گئے تھے۔ آسمانوں پر پہلے بھی شیطانوں کی دراندازی سے بچنے کے لیے پہرے ہوتے تھے، لیکن اب ہم جو نہی آسمان کے قریب پھٹکتے تو شہاب ثاقب کو اپنی تاک میں پاتے۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ دنیا والوں کی ہدایت کے لیے قرآن مجید کو اتار رہا تھا۔ اور اس سورہ میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کو کھلے افق پر دیکھا اور جبریل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی پہنچانے کا آغاز کیا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جس طرح وہ وحی کے راستوں کو ہر شر سے محفوظ کرتا ہے، اسی طرح وہ وحی کو پہنچانے والے فرشتوں اور نبیوں کی بھی حفاظت کرتا ہے، اور اب قیامت تک اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا۔

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

فکر اسلامی کو درپیش جدیدیت کے چیلنج اور مدارس اسلامیہ

(۲؍ مئی ۲۰۲۴ء کو جامعہ ہمدرد میں مدارس اسلامیہ اور عصر حاضر کے مطالبات پر منعقد ہونے والے سیمینار کے لیے لکھا گیا)

موجودہ زمانے کا غالب طرز فکر جدیدیت یا ماڈرنیٹی ہے، جس کا غلغلہ مغرب و مشرق ہر جگہ ہے اور جس کی یلغار سے مذہب، ثقافت اور تعلیم کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ جدیدیت نے جو چیلنج پیدا کیے ہیں، وہ متعدد ہیں، ان کی جہتیں اور نوعیتیں مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر خدا، مذہب، شریعت، اخلاقی اقدار اور ان کے معیارات، سب اس کے چیلنجوں کی زد میں ہیں۔

مدارس اسلامیہ جو اسلام کے قلعے سمجھے جاتے ہیں، مفروضہ یہ ہے کہ یہاں سے اسلام کے محققین پیدا ہوتے ہیں اور اسلام کی شرح و ترجمانی کا حق ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ وہ قرآن و سنت سے براہ راست واقف ہوتے ہیں، وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا مدارس اسلامیہ جدیدیت کے چیلنجوں سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں؟ کیا وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو جدیدیت سے آشنا کیا جاتا ہے؟ اور کیا وہ اس کے چیلنجوں کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہیں؟ اگر نہیں تو اس کے لیے کون سے اقدامات کی ضرورت ہے؟ اس مقالہ میں ان سوالوں اور ان سے متعلقہ مباحث کا جائزہ لیا جائے گا۔

جدیدیت کیا ہے؟

''ویکیپیڈیا'' کے مطابق جدیدیت کی تعریف یہ ہے:

''جدیدیت، ہیومینٹیز اور سوشل سائنسز کا ایک موضوع ہے، یہ ایک تاریخی دور بھی ہے اور خاص سماجی و ثقافتی اصولوں، رویوں اور طریقوں کا مجموعہ بھی، جو ۱۷ویں صدی کی نئی سوچ اور عقلیت کے دور میں اور ۱۸ویں صدی کی روشن خیالی کے زمانے میں، یعنی نشاۃ ثانیہ کے بعد پیدا ہوا تھا۔''[1]

آپ کبھی 'جدیدیت' کا لفظ بولیں تو جدید لباس، نئے آلات و وسائل، بڑی بڑی عمارتیں اور روایت سے ہٹ کر نئے تصورات ذہن میں آتے ہیں، جب کہ مسلمان معاشروں میں جدیدیت سے مراد ماڈرن لباس سے لے کر فلک بوس عمارتیں، سیکولر و مذہب بے زار خیالات، بلکہ بے حیائی و الحاد تک سب کو لے لیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے محسوس مظاہر، نئے نئے فیشن اور زیادہ سے زیادہ کی ہوس، یعنی مادیت پرستی کو بجا طور پر اسلامی لٹریچر میں تنقید کا نشانہ بھی خوب بنایا جاتا ہے، مگر اس سے متعلق اصولی بحث خال خال ہی ملتی ہے۔

سولھویں صدی کے اوائل میں یورپ کے لوگوں نے ایک مختلف تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی، جس کے لیے ان کو سائنسی مطالعات اور ٹیکنالوجی کے لیے ترجمہ کے ذریعے سے یورپی زبانوں میں منتقل ہونے والے اسلامی و عربی منابع (کتب، علوم و ایجادات) سے بہت مدد ملی تھی۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں وقوع پذیر ہونے والے اس سائنسی انقلاب نے ثابت کیا کہ کائنات میں ہونے والے تمام واقعات کی وضاحت چند سائنسی قوانین کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اس حقیقت کے ادراک نے کائنات کے بارے میں انسان کے تصورات کو یک دم تبدیل کر دیا۔ اس سائنسی انقلاب کے نتیجے میں کائنات ایک مشین کی طرح محسوس ہونے لگی، جس میں ہونے والا ہر واقعہ ایک دوسرے سے مربوط ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو:

"Modernity, a topic in the humanities and social sciences, is both a historical period and the ensemble of particular socio-cultural norms, attitudes and practices that arose in the wake of the Renaissance—in the Age of Reason of 17th-century thought and the 18th-century Enlightenment."

نیز حسن عسکری: جدیدیت یا مغربی گم راہیوں کا خاکہ، مشمولہ مجموعہ حسن عسکری انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔

اِس تہذیب کی بنیاد ماضی کی زرعی معیشت کے بجائے مشینوں، کلوں، نئے علوم اور نئی ٹیکنیکس اور سرمایہ و ٹیکنالوجی پر تھی۔ اِس تہذیب نے جو ایک عمومی مغربی رویہ پیدا کیا، سادہ لفظوں میں وہی ماڈرنیٹی اور جدیدیت ہے، جو اب پوری دنیا کا غالب طرز فکر ہے۔ اور اب صرف یورپ و امریکا تک محدود نہیں، ساری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ ہاں، فی زمانہ اس طرز فکر کا سب سے بڑا علم بردار امریکا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی نے نہ صرف انسانوں کے سوچنے کے طریقے بدلے، ان کے ذہن و مزاج بدل دیے، بلکہ سائنس کے غلط استعمال سے آلودگی پیدا کی اور نظام فطرت کو چیلنج کیا۔ جدید انسان جینیٹک تبدیلیاں پہلے حیوانوں میں اور اب انسانوں میں پیدا کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔

جدیدیت کے چیلنج

جدیدیت ایک نظریہ بھی ہے اور ایک رویہ بھی۔ اِس کے پیدا کردہ چیلنجوں میں سرفہرست ڈارونی ارتقا کے ذریعے سے خدا کے وجود کو چیلنج کرنا ہے، جس کے مطابق یہ کائنات آپ سے آپ کچھ نیچرل قوانین کے تحت نیچرل کیمیکلز کے تعامل سے پیدا ہو گئی اور اس میں زندگی کا وجود بھی خود بخود ہوا۔ لہٰذا دین و شریعت اور اخلاق اس کے نزدیک سب اضافی قرار پائے۔ جدیدیت کے علم برداروں نے ڈارونی ارتقا کو اصل مان کر پوری انسانی تاریخ کی اسی کے مطابق توجیہ کی ہے۔ موجودہ دور کے ایک مقبول عام مصنف یوال نواحراری نے اپنی کتابوں میں خاص طور پر خدا، مذہب اور تہذیب، سب کو مائنس کر کے انسانوں کی تاریخ لکھی ہے۔[۲] حراری خاص طور پر مذاہب کی ابراہیمی روایت کے خلاف ہے۔ اُس کا استدلال ہے کہ ابراہیمی مذاہب دوسرے عقائد و مذاہب کے تئیں روادار نقطۂ نظر نہیں رکھتے، بلکہ اپنے سچے ہونے پر اصرار کرتے ہیں، لہٰذا دنیا میں بین المذاہب ہم آہنگی اِن کے ذریعے سے ممکن نہیں ہے۔ اِسی نکتہ کو ہندوستان کے سیکولر و نان سیکولر ہر دو قسم کے ہندو دانش ور اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں شدومد سے دہراتے رہتے ہیں۔ حراری نے اِس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ ابراہیمی مذاہب کے برخلاف مشرکانہ مذاہب دوسرے مذاہب و افکار کے تئیں زیادہ فراخ دل ہوتے ہیں۔ اِس خیال کو ہندو دانش وروں میں خوب پذیرائی ملی ہے۔ اپنی کتاب "Homo Sapian" میں وہ کہتا ہے:

"The insight of Polytheism is conducive to far-reaching

۲۔ یوال نواحراری اسرائیلی ینچر لسٹ مؤرخ اور ماہر مستقبلیات ہے۔ اس کی تین کتابیں مشہور ہیں:
"Homo Sapian", "Homo Deus" and "21 Lessons for 21 century".

religious tolerance.”(P: 239)[3]

ا۔ جدید کاسمولوجی، جو سائنس و ٹیکنالوجی نے تشکیل دی ہے، اس نے مذہب کے روایتی موقف پر جو سوال کھڑے کر دیے ہیں، ان پر غور و فکر کرتے ہوئے پہلا اصولی مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ آج ارسطو کا وہ ورلڈ ویو جو سترہ صدیوں تک دنیا پر چھایا رہا، مسترد ہو چکا ہے۔ اس ورلڈ ویو میں زمین کائنات کا مرکز تھی، وہ ساکن تھی، سورج اس کے گرد چکر لگاتا تھا (پرانی ادبیات میں اسی لیے آسمان کو گردوں کہتے تھے)، کائنات ارضی کا مرکز توجہ، مخدوم اور امین انسان تھا۔ بعض لوگ اس کو خلافت ارضی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس ورلڈ ویو میں اسلام کے حامی اور مخالف، دونوں ایک ہی پیج پر تھے، مگر اب وہ افسانۂ پارینہ ہے۔

آج جو ورلڈ ویو دنیا کو رول کر رہا ہے، وہ گلیلیو، ڈیکارتے، نیوٹن، ہبل اور آئن اسٹائن وغیرہ کے سائنسی نظریات اور تحقیقات پر مبنی ہے۔ سائنسی انقلاب نے یہ سوچ پیدا کی کہ کائنات قوانین فطرت کے تحت چل رہی ہے، جن میں خدا بھی دخل نہیں دے سکتا۔ اس انقلاب نے خدا کے تصور کو ختم تو نہیں کیا، لیکن اب کائنات کے ارتقا کو سمجھنے میں خدا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ اس کائنات کے نظام کو سمجھنے میں خدا کی ضرورت نہیں، ظاہر ہے کہ یہ راستہ الحاد کی طرف جاتا ہے۔

اس ورلڈ ویو کے مطابق زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، سورج اور دوسرے ستارے و سیارے اپنے اپنے محور پر گردش میں ہیں۔ انسان کو کوئی خاص پوزیشن، (مثلاً اسلامی ادبیات میں خلیفہ فی الارض اور اشرف المخلوقات ہونا) اس زمین پر حاصل نہیں۔ بلینوں کہکشانوں پر محیط اس کائنات میں خود زمین ایک نقطہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ارتقا اور اب بگ ہسٹری کے تصورات نے مذہب کے نظریۂ تخلیق اور انسان کی خصوصیت و اشرفیت کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں انسان کو ’An Animal of no significance‘ کہا جاتا ہے جو کہ حراری کی کتاب ”Homo Sapian“ کا پہلا باب ہے۔ بگ بینگ یا نیچرل ارتقا پر مبنی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ نہ اس کائنات کا کوئی مقصد ہے اور نہ انسان کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔ یہ کائنات و مافیہا سب نیچر کے

۳۔ حالاں کہ یہ یُوال نوا حراری اور اس کے مقلد دانش وروں کی بے بصیرتی ہے۔

وہ اپنے بیانات میں اِس بات کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ہندو مذہب نے اپنے احیائی عہد میں دوسرے مذاہب، خاص طور پر بودھ مت کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا کہ اس کے نشانات تک مٹا کر رکھ دیے۔ ایک ہندو راجہ پشپامترا نے ۸۰ ہزار سے زائد بودھ استوپا (معابد) کو تباہ کر دیا تھا۔

اندھے قوانین کے تحت وجود میں آئی اور انھی قوانین کے تحت اپنے آپ بے مقصد ختم بھی ہو جائے گی۔ ایسے میں خدا کا وجود، حشر نشر، آخرت وغیرہ کے تصورات سب غیر سائنٹیفک تصورات قرار پاتے ہیں۔

۲۔ مذہب انسان کی جو تاریخ اور کہانی بتاتا ہے، وہ پانچ چھ ہزار سال سے پیچھے نہیں جاتی، جب کہ بگ بینگ اور نیچرل ارتقا پر مبنی تاریخ عظیم بتاتی ہے کہ کائنات کی عمر قریباً تیرہ ارب سال ہے۔ اس کے مطابق ہماری زمین سات ارب سال پہلے بنی اور اس پر زندگی کا وجود پانی میں تقریباً چار ارب سال پہلے ہوا۔ زندگی نے مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر بلینوں سال پہلے حیوانی قالب اختیار کیا۔ ارلی انسان اور نینڈر تھیل وجود میں آئے، لاکھوں سال کے گزرنے اور نیچرل سلیکشن سے گزرتے ہوئے وہ ہنٹنگ گیدرنگ کے مرحلہ میں پہنچا۔ ایک لاکھ نوے ہزار سال ہنٹنگ اور گیدرنگ کے مرحلہ میں رہنے کے بعد وہ آئس ایج اور اس کے بعد حجری زمانہ سے گزر کر زراعت کے دور میں داخل ہوا اور ایک متمدن معاشرہ کی بنیاد پڑی۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور زراعت کے بعد موجودہ صنعتی معاشرہ وجود میں آیا۔[۴]

تاریخ عظیم کی یہ کہانی بتاتی ہے کہ بایولوجی کے اعتبار سے مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مختلف معاشروں میں ہم جو فرق ان دونوں میں دیکھتے آئے ہیں، وہ اصل میں کلچرل موثرات کی وجہ سے ہے، اس کی کوئی حقیقی وجہ نہیں۔ "Homo Sapian" کے مصنف کا کہنا ہے کہ "انسانی سماج میں مرد کے وظائف، عورت کے وظائف اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انسانی جسم کے مختلف اعضا کے بامقصد وظائف کا تصور ان نیچرل ہے۔ وہ اصل میں مسیحی تھیولوجی سے آیا ہے، ورنہ بایولوجیکلی کسی چیز کا کوئی مقصد اور ہدف نہیں ہوتا۔ مرد قوام ہے اور عورت گھر کی ملکہ ہے وغیرہ تصورات اصل میں انسانی Imagination کے ساختہ ہیں"۔[۵] وہ کہتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر چیزوں کو imagine کرتا ہے۔ چنانچہ یہ انسانی کلچر، ثقافت و تہذیب، مذہب و روحانیت، اخلاقی احساس وغیرہ، یہ سب اس کی imagination کا نتیجہ ہیں اور ایک myth ہیں، ورنہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔[۶] یہ کاسمولوجی کہتی ہے کہ تاریخ blindly سفر کرتی ہے اور اس کائنات اور اس پر زندگی کا کوئی مقصد نہیں، ایک دن یہ یونہی Blindly ختم بھی ہو جائے گی۔ ناظرین دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو بیانیہ ہے یہ اپنے اندر مذہب، وجود باری تعالیٰ وغیرہ کے کتنے بڑے چیلنج رکھتا ہے اور ہماری اس فتنہ سے مقابلہ کی تیاری کیسی

۴۔ ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، کائنات کا آغاز وارتقاء، ماہنامہ اشراق المورد لاہور، جنوری/فروری ۲۰۲۱ء۔

۵۔ ملاحظہ ہو: An imagined order ص ۱۱۴۔

۶۔ ایضاً صفحہ ۱۲۳۔

ہونی چاہیے، یہ کسی پر مخفی نہیں۔

۳۔ تیسرا مسئلہ مغربی سائنس وٹیکنالوجی کا پیدا کردہ یہ ہے کہ آج جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعے سے، یعنی انسانی جینوم کو کنٹرول کرنے کے پروگراموں کے ذریعے سے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اپنے من پسند انسان پیدا کیے جاسکیں۔ کلوننگ کا عمل جو شروع میں ڈولی نامی بھیڑ پر کیا گیا اور اس کا ہم زاد پیدا کیا گیا تھا، اب بات اس سے بہت آگے بڑھ چکی ہے اور پیڑ پودوں، سبزیوں اور اناجوں سے گزر کر اب حریم انسانی اس کی زد میں آیا چاہتا ہے۔

جاپان میں مردوں کی آخری رسومات ایک روبوٹ انجام دے رہا ہے، جرمنی میں چرچ کے اندر ایک روبوٹ پادری کلیسائی مذہبی فرائض انجام دے رہا ہے۔ AI یعنی آرٹیفیشل انٹیلی جنس[۷] کے ذریعے سے روبوٹ اب محض مشینی آلات نہ رہ کر انسانی ذہن وشعور کے حامل بھی ہوں گے اور وہ دن دور نہیں جب ہمارے امام و مؤذن روبوٹ ہوا کریں گے۔ دنیا میں مصنوعی ذہانت کا چرچا ہے، جس سے بڑے بڑے کام لیے جارہے ہیں اور یہ ہر یونیورسٹی میں پڑھائی جارہی ہے۔ ترجمہ کے میدان میں مصنوعی ذہانت کا استعمال ہو رہا ہے۔ کبھی فلموں میں اور فکشن میں روبوٹک بیویوں کی بات آیا کرتی تھی، مگر اب تو وہ سچائی بن کر انسانوں کے سامنے آنے والی ہے۔ سفاک اسرائیل فلسطینیوں کے قتل عام کے لیے AI کا استعمال خوب کر رہا ہے۔ تو سوال دینیات اور اہل مدارس کے سامنے یہ ہوگا کہ روایتی معاشرتی احکام اِن نئے قسم کے اور انوکھی نوعیت کے انسانوں پر کس طرح لاگو ہوں گے ؟ کیا وہ سرے سے شریعت کے مخاطب بھی رہ جائیں گے یا نہیں ؟ یا ان کے لیے کوئی اور ہی فقہ ڈویلپ کی جائے گی ؟

۴۔ جدیدیت نے ایک بڑا چیلنج سائنٹزم کا پیدا کیا، جس میں سائنس کو اٹھا کر مذہب کی جگہ دے دی گئی۔ انیسویں صدی میں اِس طرز کا بول بالا رہا۔ بیسویں صدی میں اِس پر خود مغرب میں بھی شدید تنقیدیں ہوئیں۔ تاہم ڈاکٹر محمد اجمل کہتے ہیں کہ :

> ”بیسویں صدی میں فلسفۂ مادیت سے بے زاری تو پیدا ہوئی، لیکن اس کا تدارک اس طرح نہیں کیا گیا کہ لوگ اصل دین کی طرف لوٹیں، بلکہ اِس طرح کہ نت نئے خداؤں کی صنعت فروغ پا گئی۔ ایسے ایسے فلسفے تعمیر

۷۔ مصنوعی ذہانت کی سادہ تفہیم کے لیے دیکھیے : مصنوعی ذہانت اور تعلیمی ترقی، ڈاکٹر محمدی شیخ، تہذیب الاخلاق، اپریل ۲۰۲۴ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کیے گئے جو بظاہر مذہبی معلوم ہوتے تھے، لیکن تحقیق کرنے پر ان کی بنیاد بھی مادیت ہی نکلتی تھی۔ برگساں ہو یا ولیم جمیز، ونگسٹائن ہو یا آئن اسٹائن سب کے سب در حقیقت مادیت کے پرستار تھے، لیکن انھوں نے نقاب روحانیت یا مذہب کے اوڑھ رکھے تھے۔“[8]

ٹیکنالوجی کی نئی نئی ترقیوں نے اِس طرز فکر کو دنیا بھر میں غالب کر رکھا ہے۔ سائنٹزم کا دعویٰ ہے کہ سائنس کے پاس انسان کے ہر مسئلہ کا حل ہے، یہاں تک کہ موت کا حل بھی ڈھونڈنے کی کوشش جاری ہے۔ سائنس دان ایسے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں جن میں موت پر قابو پالیا جائے گا یا کم از کم انسان کی عمر کا دورانیہ مخصوص ڈرگز کے ذریعے سے ناقابل یقین حد تک بڑھا لیا جائے گا۔ اب کاریں، فریج وغیرہ آنکھوں کے اشاروں پر کام کریں گی۔ اس کے علاوہ انسان کے جسم پر ڈرگز کی حکمرانی ہوگی۔ جینوم پراجیکٹ کے ذریعے سے مخصوص جین لے کر خاص قسم کے مطلوبہ انسان پیدا کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ انسان فطری غذا پر زندگی نہیں گزارے گا، بلکہ اب مصنوعی غذائیں Artificial food اور Synthetic food کا عادی ہوگا۔

۵۔ انسانی زندگی میں مختلف جذبات کی بڑی اہمیت ہے اور بہت سے دینی احکام بھی انھی جذبات، مثلاً محبت و الفت، رحم و مہربانی، نفرت و کراہیت، غصہ و حسد وغیرہ کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔ انسانی تہذیب ان کی بنیاد پر ترقی کرتی ہے، سماجی رشتے ان سے بنتے بگڑتے ہیں۔ اب ڈرگز اور دواؤں کے ذریعے سے ان کے جذبات کو ختم کرنے، ان کو کنٹرول کرنے یا ان کو بدل دینے کی بات کی جا رہی ہے۔[9] حتیٰ کہ ایک بڑا پراجیکٹ انسانی جین پر تحقیق کے ذریعے سے اس امکان کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے کہ موت کا خاتمہ انسان کی زندگی سے کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یا انسان کی زندگی کا دورانیہ بڑھا دیا جائے اور وہ ہمیشہ جوان رہے، اُسے کوئی مرض لاحق نہ ہو وغیرہ۔[10] اگر ایسا کسی بھی درجہ میں ہو جاتا ہے تو اس سے روایتی فقہی احکام پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا ان چیزوں

۸۔ مجموعۂ حسن عسکری، ص ۱۱۷۷، پیش لفظ۔

۹۔ ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، نئی کاسمولوجی کا چیلنج، ماہنامہ اشراق ہند اکتوبر ۲۰۱۹ء المورد فاؤنڈیشن الہند۔

۱۰۔ جینوم پراجیکٹ کے لیے دیکھیے وکیپیڈیا:

“Genome projects are scientific endeavours that ultimately aim to determine the complete genome sequence of an organism and to annotate protein-coding genes and other important genome-encoded features. The genome sequence of an organism includes the collective

کو تغییر خلق اللہ کی قبیل سے سمجھا جائے گا یا نہیں؟

ہمارے علما گذشتہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے تصویر کے مسئلہ سے الجھے ہوئے ہیں کہ آیا فوٹو میں کسی شے کی حقیقت خود آجاتی ہے یا اس کا عکس آتا ہے؟ تصویر اگر سر کٹی ہو تو جائز ہو گی یا نہیں؟ ڈیجیٹل کیمرے سے لیے گئے فوٹو پر حدیث میں آئی وعید کا اطلاق ہو گا یا نہیں وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ اب سائنس و ٹیکنالوجی جس دنیا کو سامنے لا رہے ہیں، اس میں ہمارے یہ فقہی قواعد وضوابط کچھ کام دیں گے؟ فی الحال کیتھولک چرچ کی مخالفت کی وجہ سے اور کچھ اور اسباب سے بعض ملکوں میں سائنس کو کچھ پابند کیا گیا ہے اور اس کی تحقیقات پر کچھ قدغنیں عائد کی گئی ہیں، مگر تا بکے؟ جب یہ جن بوتل سے باہر آئے گا تو نطشے نے تو God is dead کہہ دیا تھا، مستقبل قریب کا انسان فرعون کی زبان میں کہے گا کہ ''میں پیدا کرتا ہوں اور مارتا ہوں، اس لیے میں ہی خدا ہوں''۔ یعنی سائنس دان ہی 'أنا ربکم الأعلیٰ' کا نعرہ مارے گا۔ حراری نے مستقبل قریب کے اِسی انسان کو Homo Deus (دیوتا انسان) سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ہیں نئی کاسمولوجی کے وہ پہلو جو ارتقا اور نیچرل ہسٹری کی بنیاد پر مذہب کے بالمقابل کائنات کے آغاز وارتقا اور زندگی کی تخلیق کا نیا بیانیہ ہمارے سامنے لا رہا ہے۔ یہ اپنے اندر مذہب کے لیے کتنے خطرے لیے ہوئے ہے، ہماری معروضات سے یہ بات کسی حد تک سامنے آجاتی ہے۔ اب اہل مذہب اور اہل مدارس کو سوچنا یہ ہے کہ اس خطرے سے مقابلہ کی کیا تیاری ان کے پاس ہے؟ وہ اپنے طلبہ کو اِن چیلنجوں کے بارے میں بتا رہے ہیں یا نہیں؟ بظاہر تو جواب نفی میں ہی ہے۔

۶۔ ٹیکنالوجی کی یہ حیرت انگیز ترقیاں ایسی ہیں کہ اِن کے سہارے اب سائنس پرست مذہب کا بطلان ثابت کر رہے ہیں۔ غرض جدیدیت یا ماڈرنیٹی نے جو چیلنج پیدا کیے ہیں، وہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور ان کی حشر سامانیوں کا سامنا اہل مذہب نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج الحاد دورِ جدید کا نیا مذہب بن چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ ساری دنیا میں مذہب و روحانیت کی طرف لوگوں کا دوبارہ رجحان بڑھا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ آج دنیا میں جتنے بڑے پیمانہ پر لامذہب، لاادری، اور ملحدین موجود ہیں، پہلے کبھی نہ تھے۔ آج کے الحاد کے پاس سائنس و ٹیکنالوجی اور نئی کاسمولوجی کے پیدا کردہ سوالات و اشکالات ہیں۔ وہ Reason اور

DNA sequences of each chromosome in the organism."

استدلال سے لیس ہے۔"[11] جس کا جواب دینے اور مقابلہ کرنے کے لیے مذہبی تنظیموں، علما اور اہل مدارس کو ماڈرنیٹی اور اس کے چیلنجوں کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔ آج جگہ جگہ ایکس مسلم (مرتدین) نظر آرہے ہیں، جو اپنے یوٹیوب چینلوں اور ویب سائٹوں کے ذریعے سے دین و مذہب، خصوصاً اسلام پر حملہ آور ہیں اور ان کے دلائل بھی زیادہ تر وہی ہیں جو دہریے اور لامذہب استعمال کرتے ہیں۔ جن میں ابن وراق اور ایان ہرسی علی کی تحریریں بہت زہر آلود ہوتی ہیں۔

مدارس اسلامیہ اور جدیدیت

موجودہ مدارس اسلامیہ کا نصاب کم و بیش دو صدیوں پرانا ہے۔ اس پورے عرصے میں دنیا میں فکر و عمل کی سطح پر بڑی تبدیلیاں آئیں، بڑے بڑے انقلابات انسانوں کے فکر، طرز زندگی اور عمل میں آئے، مگر مدارس نے شروع سے ہی اپنی کھڑکیاں بند کر لی تھیں، اس لیے ان کو ان میں سے کسی چیز کی بھی ہوا نہیں لگ سکی۔ ایک آدھ استثنا کے ساتھ مدارس اسلامیہ آج بھی کم و بیش اسی رویہ پر قائم ہیں۔

علمائے کرام اور اہل مدارس میں جدیدیت کو سمجھنے، اس کے چیلنج کو جاننے اور اس سے مکالمہ کرنے (engage) کرنے کی خواہش عموماً نہیں پائی گئی۔ علما کی صفوں میں اُس کے بعض مظاہر کو سمجھنے اور ان کے جواب کو کافی سمجھ لیا گیا۔ اور ایسے علما کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے جنھوں نے سائنس اور ماڈرنیٹی کو سنجیدگی سے لیا ہے۔ مثلاً سر سید احمد خان، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا شہاب الدین ندوی، عبد الباری ندوی اور مولانا وحید الدین خاں وغیرہ۔ جدیدیت کے سیاسی مظاہر و عمرانی تصورات پر مولانا مودودی نے زبردست تنقیدیں کی ہیں اور اس کے سائنسی کلامی پہلوؤں کا مطالعہ اور ان کا جواب مولانا وحید الدین خاں نے دیا ہے۔[12]

ماڈرنیٹی، جدیدیت یا مغربی فکر کے رد و قبول کے سلسلہ میں مسلمان اہل فکر میں تین طرح کے موقف سامنے آئے:

۱۱۔ ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، جدید الحاد کا چیلنج، ماہنامہ رفیق منزل، اکتوبر ۲۰۱۸ء اور رچرڈ ڈاکنز کی ویڈیوز یوٹیوب پر
https://www.youtube.com/watch?v=bdvoe0j4Hjw

۱۲۔ ملاحظہ ہو: مولانا وحید الدین خاں، علم جدید کا چیلنج، مذہب اور سائنس، اسلام دور جدید کا خالق، عقلیات اسلام، کتاب معرفت اور کتاب حکمت وغیرہ۔

۱۔ مغربی فکر کو جوں کا توں قبول کرنا یہ سر سید اور ان کے رفقا کی رائے تھی اور بد قسمتی سے مغربی فکر کے بہت سطحی و سر سری مطالعہ و مشاہدہ پر مبنی تھی۔

۲۔ اس فکر کو قطعی طور پر مسترد کرنا یہ روایتی علما کا نقطۂ نظر تھا۔

۳۔ تیسرا موقف 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کے اصول پر مبنی تھا اور یہ کم و بیش تمام اسلامی احیائی تحریکوں نے اپنایا اور بتدریج روایتی نقطۂ نظر بھی اسی کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔

مگر مدارس کے نصابات کو عموماً اس سے دور ہی رکھا گیا ہے۔ اور آج بھی کم و بیش یہی فضا برقرار ہے۔ جو مدارس اپنے نصاب اور نصاب تعلیم میں بہت ماڈرن، روشن خیال اور متحرک سمجھے جاتے ہیں، ان کے نصابات بھی جدیدیت کے بعض سطحی مظاہر کو چھو کر گزر جاتے ہیں، مثلاً ان میں معاشیات، نفسیات اور سیاسیات کا کچھ نہ کچھ تعارف کرا دیا جاتا ہے اور تھوڑی سی انگریزی پڑھا دی جاتی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ مدرسہ ڈسکورسز پروگرام نے، البتہ اِس سے خاصا اعتنا کیا تھا اور منتخب فضلاے مدارس کو اسلامی کلامی روایت کے پہلو بہ پہلو جدیدیت اور اس کے چیلنجوں سے متعارف کرانے کی کوشش کی تھی۔[۱۳]

جدیدیت پر اردو میں اسلامی نقطۂ نظر سے کچھ خاص نہیں لکھا گیا، البتہ اردو کے بڑے ادیب و ناقد حسن عسکری نے (جن کا مغربی ادب انگریزی اور فرنچ کا گہرا مطالعہ تھا) ایک تعارفی کتاب ''جدیدیت یا مغربی گم راہیوں کا ایک خاکہ'' کے نام سے طلبۂ مدارس کے لیے لکھی تھی۔[۱۴]

۱۳۔ مدرسہ ڈسکورسز انڈیا ۲۰۱۶ء-۱۹ء تعارفی کتابچہ پس منظر اور اہداف، Contending Modernities N.D. EDU۔

Keugh School of Global Affaires University of Notre Dame۔ یہ پروگرام پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے شروع کیا تھا جو بیک وقت مشرقی و مغربی علوم کے جامع ممتاز اسکالر ہیں اور نوٹرے ڈیم یونیورسٹی (امریکا) میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ اپنی ایکٹیو صورت میں تو یہ پروگرام فی الحال معطل ہے، البتہ محاضرات کے ذریعے سے اس کا تسلسل باقی رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس لنک پر جائیں:

https://madrasadiscourses.org/

۱۴۔ مجموعۂ حسن عسکری، ص ۱۱۷۸۔ عسکری اپنے مذہبی اور تنقیدی، دونوں ہی خیالات میں انتہا پسند تھے۔ اس کے بعد ان سے متاثر ایک مکتب روایت پاکستان میں وجود میں آیا ہے، جس میں ناقد سلیم احمد اور ان کے شاگرد احمد جاوید،

یہ کتاب اصلاً ایک فرنچ مسلم کنورٹ رینے گینوں (عبد الواحد یحیٰ) کے مغرب پر ناقدانہ خیالات کی تلخیص تھی، اور دار العلوم کراچی کو اس کو اپنے نصاب میں شامل کرنا تھا، مگر وہ کی نہیں گئی۔ یہ کتاب راقم کے مطالعہ میں آئی ہے۔ اس میں دو کمیاں ہیں: ایک تو حوالوں سے معریٰ ہے۔ دوسرے اس میں مغرب کے بارے میں انتہا پسندانہ موقف اپنایا گیا ہے۔

ضروری اقدامات

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ مدارس اس مسئلہ سے اپنے طلبہ کو کیسے واقف کرائیں تو اس کے لیے درج ذیل اقدامات کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ مولانا وحید الدین خاں کی منتخب کتب، مثلاً ''علم جدید کا چیلنج'' کا مطالعہ طلبہ کے لیے لازمی کر دیا جائے اور اس پر نمبرات دیے جائیں۔

۲۔ جدیدیت پر تعارفی لٹریچر کا مطالعہ کرایا جائے، خاص کر منتہی درجات کے طلبہ سے۔

۳۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر ماہرین سے مطالعے کرائے جائیں۔

۴۔ انگریزی میں یا اردو میں اس موضوع پر متعلقہ کتب کے مخصوص ابواب کا مطالعہ کرایا جائے، مثلاً چارلس ٹیلر کی کتاب ''The Secular Age'' کی بعض فصلوں کا مطالعہ۔

۵۔ اس موضوع پر مدرسہ ڈسکورسز کے بانیان اور اساتذہ کے صلاح و مشورہ سے مزید تعارفی لٹریچر تیار کرایا جاسکتا ہے۔ اس عمل کے لیے مدارس کے موجودہ درس نظامی (یا دوسرے نصابات) میں فرسودہ مضامین اور کتب کی غیر ضروری تکرار کو ختم کر کے نصابی بوجھ کم کر کے گنجایش پیدا کی جاسکتی ہے۔

یا بڑے مدارس، مثلاً دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلما، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح اور جامعہ اشرفیہ و جامعہ سلفیہ وغیرہ میں الگ سے شعبے کھولے جاسکتے ہیں، جن میں یک سالہ کورس کے ذریعے سے افتاء، دورۂ حدیث اور تخصص و فضیلت کر چکے منتخب فضلا کو مغربی فکر اور انگریزی زبان، سائنس اور جدید فلسفہ سے متعارف

جاوید اکبر انصاری، عبد الوہاب سوری، خالد جامعی اور دین محمد جوہر خاص ہیں۔ انھوں نے جامعہ کراچی میں تفہیم مغرب کے عنوان سے کام کیا ہے (جامعہ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش) مگر اپروچ بہت جارحانہ اور انتہا پسندانہ محسوس ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں کا ایک لنک یہ ہے:

http://kurfku.blogspot.in/?m=0

کرایا جائے۔

بقول حسن عسکری ۱۹۳۰ء کے قریب مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا تھا کہ ''میری آنکھیں تو یہ دیکھ رہی ہیں کہ اب اسلام کی حفاظت کرنے والے یورپ سے اٹھیں گے''۔[15] لیکن علما و اہل مدارس نے ان کے قول پر کوئی توجہ نہیں کی۔ نہ یورپ کے نئے انقلاب کو جاننے کی کوشش کی اور نہ اس سے مقابلے کی تیاری کی۔ اسی طرح ''تجدید و احیاء دین'' میں مولانا مودودی نے بھی تحریک شہیدین کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا ماتم کیا تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''انھوں نے سب کچھ کیا، مگر اتنا نہیں کیا کہ ایک وفد بھیج کر یہ پتا لگانے کی کوشش کرتے کہ اِس نئی تہذیب کی طاقت کا راز کیا ہے''۔[16] لیکن بعد میں تحریک اسلامی نے بھی اِس ضروری کام پر کما حقہٗ توجہ نہیں دی۔

جس طرح مغرب میں اسلام اور اسلامی علوم کے مطالعہ و تحقیق کے لیے استشراق کو رواج دیا گیا، اُسی پیٹرن پر عالم اسلام میں مغرب کو سمجھنے اور اس کی فکر پر مطالعہ و تحقیق کے لیے استغراب (مطالعۂ غرب) کا سلسلہ قائم ہونا چاہیے تھا، جو افسوس کہ نہیں ہو سکا اور اب بھی مسلم دنیا میں ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جہاں اس موضوع پر کام کیا جاتا ہو۔ ایسا ادارہ یا ایسے افراد تیار کرنا جو اسلام کے عالم ہونے کے ساتھ ہی مغربی فکر کے بھی ماہر ہوں، وقت کی اولین ضرورت ہے۔

۱۵۔ مجموعۂ حسن عسکری، ص ۱۱۷۲۔

۱۶۔ دیکھیے: مولانا مودودی، تجدید و احیاء دین: اسلامک پبلیکیشنز لاہور، مئی ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۵-۱۲۸۔

محمد ذکوان ندوی

رفقاے المورد کے نام

[زیر نظر تحریر اصلاً ایک خط پر مبنی ہے۔اِس کی عمومی اشاعت مطلوب نہیں تھی۔تاہم حال میں اِسے دیکھ کر رفقاے المورد، خصوصاً برادرم محمد حسن الیاس (اکیڈمک ڈائریکٹر غامدی سنٹر، امریکا) نے کھلے دل سے قدرافزائی کرتے ہوئے اصرار فرمایا کہ اِسے ضرور شائع کیا جائے۔ لہٰذا اب بعد از نظر ثانی اِسے رفقا و ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

راقم مختلف مکاتب فکر، مدارس، اسکول و کالج اور متعدد نیشنل اور انٹرنیشنل، دونوں طرح کے اداروں اور افراد سے بہت قریبی طور پر وابستہ رہا ہے۔تاہم، تجربات شاہد ہیں کہ اِن تمام مذہبی اور غیر مذہبی اداروں کے درمیان ''المورد'' وہ واحد ادارہ ہے جو علمی تنقید کے معاملے میں اب تک ایک استثنائی ادارہ ثابت ہوا ہے۔ یہاں نہ صرف بشاشت کے ساتھ تنقید سننے، بلکہ اپنے خلاف باتوں کی اشاعت اور اُس کی حوصلہ افزائی کا ایک استثنائی ماحول پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے نقطۂ نظر پر اب تک کی گئی تمام علمی تنقیدات کو المورد نے خود باقاعدہ اپنے ذاتی ویب سائٹ پر شائع کر دیا ہے۔ دوسرے متعدد تجربات کے علاوہ، زیر نظر تحریر خود اِس علمی اور اخلاقی طرز عمل کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

زیر نظر خط دیکھنے کے بعد المورد کے تمام احباب نے نہ صرف اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، بلکہ اِس پر نظر ثانی کر کے اِسے ایک خط کے بجاے اب ایک مستقل تحریر کی صورت دینے کا مشورہ دیا تا کہ اِس کی افادیت واضح ہو اور لوگ سنجیدگی کے ساتھ اِس پر توجہ دے سکیں۔ چنانچہ پہلے اِس کو علی حالہٖ ماہنامہ اشراق، امریکا کے صوتی اور تحریری، دونوں ایڈیشن (مئی ۲۰۲۴ء) میں شائع کیا گیا۔ البتہ، اب مزید اضافہ و نظر ثانی کے بعد دوبارہ اِس کو شائع کیا جارہا ہے۔

یہ برتر علمی اور اخلاقی روایت المورد کے محترم بانی اور مربی استاذ جاوید احمد غامدی نے مسلسل خود اپنے قول اور عمل سے قائم فرمائی ہے۔ یہ وہ عظیم عملی نمونہ ہے جسے لازماً ہمارے اداروں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اِس کے بغیر نہ کوئی منظم اور کارآمد ٹیم بن سکتی ہے، اور نہ مطلوب انداز میں کبھی ایک کامیاب ادارے کو چلایا جا سکتا ہے۔ جس ادارے میں خوے دل نوازی اور قدر دانی کا فقدان ہو اور جہاں کھلے ذہن کے ساتھ اپنے خلاف سننے اور اُس کی حوصلہ افزائی کا یہ مطلوب ماحول نہ ہو، وہاں صرف مفاد پرستانہ مزاج اور فکری جمود پیدا ہو گا، نہ کہ علمی اور اخلاقی ارتقا۔ اِس نامطلوب صورت حال کے ذمہ دار دوسرے لوگ نہیں، بلکہ صرف اداروں کے ارباب حل و عقد ہیں۔ یہی لوگ خود شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے گرد اِس قسم کا دہرا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی یا بری روایت ہمیشہ بڑے لوگ قائم کرتے ہیں، نہ کہ چھوٹے لوگ۔

محمد ذکوان ندوی]

استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے ساتھ شعر و ادب، فلسفہ و شریعت، اِسرا و معراج، حکمت و قانون، نکاح و طلاق، اصول و مبادی اور نظم کلام جیسے علمی موضوعات پر گفتگو بہت اہم اور قابل قدر ہے۔ ہم جیسے طلبہ کو چاہیے کہ وہ اِسے گہرائی کے ساتھ سمجھیں اور فکر فراہی پر مبنی اِس عظیم علمی روایت سے بھرپور انداز میں استفادہ کریں۔ علم دین سے دل چسپی رکھنے والے افراد کے لیے اِن مباحث کی تفہیم اور تحقیق کا کام، بلاشبہ ضروری ہے۔ فکری بصیرت اور علمی استعداد کی اِس ضرورت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم، عالمی سطح کے پورے ایک ادارے اور اُس کے تمام افراد کا مستقل طور پر صرف چند مخصوص موضوعات تک محدود ہو کر رہ جانا ہرگز کوئی صحت مند طرز عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ صورت حال اکثر علمی اور ذہنی ارتقا کے بجاے فکری جمود کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جہاں سارے لوگ ایک ہی انداز میں سوچتے ہوں، وہاں عموماً جو کچھ ہوتا ہے، وہ ذہنی ارتقا نہیں، بلکہ صرف فکری اور ذہنی جمود ہوا کرتا ہے:

When everyone thinks alike, no one thinks very much.

گروہی عصبیت اور تحزب سے اجتناب

اِسی کے ساتھ، ہمارے لیے انتہائی حد تک ضروری ہے کہ ہم مسلسل اپنی اخلاقی روایت کے مطابق، اِسی طرح اپنے آپ کو تمام تعصبات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ استاذ جاوید احمد غامدی نے ایک قرآنی لفظ

'رِجس' (یونس ۱۰: ۱۰۰) کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بار راقم سے فرمایا تھا کہ 'رِجس' کی بہت سی قسمیں ہیں۔ چنانچہ تعصب بھی 'رِجس' کی ایک قسم ہے۔ تعصب، علم کا 'رِجس' ہے۔ تعصب حصول علم کے لیے نہ صرف ایک رکاوٹ ہے، بلکہ اِس سے علم اپنی خالص اور بے آمیز صورت میں باقی نہیں رہتا۔ تعصب، علم کو آلودہ اور ذہن و فکر کو جامد بنا کر رکھ دیتا ہے۔

ایک زوال یافتہ قوم، بلاشبہ اکثر اپنے بڑے لوگوں کو نگل جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا نصف اول، عموماً افکار کا جنگل طے کرنے میں، اور نصف ثانی اِس قوم کے درمیان پھیلے ہوئے بے معنی مسائل و مباحث کا دنگل لڑنے میں گزر جاتا ہے۔ تاہم فکری اور تجدیدی نوعیت کے کام کا عزم لے کر اٹھنے والے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ انتخابی طریقہ (selective pattern) اختیار کریں تاکہ وقت اور توانائی کو متعین اہداف پر مرتکز رکھ کر مطلوب کام انجام دیا جاسکے۔

یہ ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ ہم بہر صورت تہ دل سے اپنے اساتذہ کا احترام کریں۔ تاہم بہتر ہو گا کہ اِن جلیل القدر علما اور اساتذہ کے لیے ہم 'قبلہ و امام' جیسے تقدیسی پس منظر رکھنے والے القاب کے بجائے 'استاد' اور 'معلم' جیسے معزز علمی الفاظ کا استعمال کریں۔ ہمیں اپنے درمیان القاب سازی کے اُس مبتدعانہ کلچر کو ہرگز فروغ نہیں دینا چاہیے جو صرف مابعد رسالت دور میں پیدا ہونے والا ایک عجمی ظاہرہ ہے۔ اِس قسم کا ظاہرہ بتدریج اِن جلیل القدر علما اور اساتذہ کے لیے 'بے خطا' (infallible) اور 'برتر از زندگی' (larger-than-life) جیسے غلو آمیز تصورات کی افزایش کا سبب بنے گا، جو اخلاقی بلندی اور علمی ارتقا، دونوں کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس طرح جمود، تفرقہ اور گروہ بندی کا وہ نامطلوب ظاہرہ پیدا ہو گا جسے قرآن میں سخت معیوب قرار دیا گیا ہے (الروم ۳۰: ۳۱-۳۲)۔

کام کا مطلوب معیار

المورد دینی موضوعات پر تحریر و تحقیق اور اُس کی نشر و اشاعت پر مبنی ایک علمی اور دعوتی ادارہ ہے۔ اِس طرح کے اداروں سے وابستہ افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اِس حقیقت کا زندہ استحضار رکھیں کہ صرف ایمان و اخلاق کی روح ہماری کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار ہے۔

مجرد تحریر و تحقیق کرنا، خطابت کے جوہر دکھانا، صوتی اور بصری پروگرام بنانا، کتب اور رسائل کا کاغذی دفتر تیار کرنا اور مضامینِ نو کا انبار لگا دینا ہرگز کوئی دینی عمل نہیں۔ مقبول دینی عمل (المائدہ ۵: ۲۷) وہی ہے جس میں

تقویٰ واخلاص کار فرما ہو، جس سے خود آدمی کے اندر خوف خدا (المومنون ۲۳: ۶۰۔ الدہر ۷۶: ۱۰) کا جذبہ بیدار ہو اور اُس کی اپنی شخصیت کے اندر ربانیت (آل عمران ۳: ۷۹) اور تزکیۂ نفس کا عمل جاری ہو سکے۔

ایمان و اخلاق کوئی الگ چیز نہیں، اِس سے مراد وہی چیز ہے جسے قرآن میں بار بار ایمان اور عمل صالح کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی خداے برتر کی ذات و صفات پر سچا یقین اور اِسی یقین و اذعان کے مطابق، عملاً اپنی پوری زندگی کی تعمیر و تشکیل۔

اِس حقیقت پر عمل پیرا ہوئے بغیر، تحریر و تحقیق کی حیثیت محض ایک ایسے سیکولر کام کی ہو گی جس کی توفیق اِس دنیا میں کبھی ایک غیر دینی شخص کو بھی مل جاتی ہے (وإِنَّ اللّٰهَ لَيُؤَيِّدُ هذا الدِّينَ بالرَّجُلِ الفاجِرِ. بخاری، رقم ۶۶۰۶۔ مسلم، رقم ۱۱۱)۔

اِس طرح کا ایک کام اُس وقت تک دینی عمل کا مصداق اور تزکیۂ نفس کا محرک نہیں بن سکتا، جب تک وہ ایمان و اخلاق کے تقاضوں کو بیدار اور اُس پر قائم کرنے کا ذریعہ ثابت نہ ہو۔

اِس روح کے بغیر دعوت، تعلیم اور تحریر و تحقیق جیسے یہ تمام مظاہر صرف حبط اعمال (ہود ۱۱: ۱۶) کا مصداق بن کر رہ جائیں گے، خداوند ذوالجلال کے نزدیک اُن کی حیثیت ایک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتی۔ اِس اصل محرک کے بغیر عمل کی ابدی میزان میں اِن بے روح سرگرمیوں اور سیاہ و بے نور لکیروں کا ہرگز نہ کوئی وزن و تاثر ہو سکتا ہے، اور نہ ہی یہ مظاہر رضاے الٰہی اور رحمت و بخشش کا سبب بن سکتے ہیں۔

اِس کے برعکس، ایمان و اخلاق اور صدق و اخلاص کے ساتھ کیا جانے والا عمل تزکیۂ نفس اور رضاے الٰہی کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ یہی تزکیہ و اخلاص ہماری صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ہر حال میں ہمیں ایک بنیانِ مرصوص (الصف ۶۱: ۴) کی طرح متحد ہو کر محض اللہ کی رضا، انسانیت کی بھلائی اور اُس کی ابدی فلاح و بہبود کے لیے تعلیم و دعوت اور علم و تحقیق کے مطلوب کاموں کا پاکیزہ اور طاقت ور حوصلہ عطا کرے گا۔

علم اور معلومات کا فرق

خدا کے دین میں، علم سے مراد مجرد تعلیم و دعوت، تحریر و تحقیق اور صرف معلومات کا دفتر ہرگز نہیں، بلکہ علم سے مراد ایمان و اخلاق کے تقاضوں کی تعمیل ہے۔ قرآن میں ایسے ہی لوگوں کو اہل علم اور اہل عقل (الزمر ۳۹: ۹) قرار دیا گیا ہے جو ایمان و اخلاق اور خشیت (فاطر ۳۵: ۲۸) کے اِن اوصاف سے بہرہ ور ہوں۔

چنانچہ صرف اُنھی لوگوں کو اہل علم (القصص ۲۸: ۸۰) تسلیم کیا گیا ہے جو دنیوی زینت، شہرت و وجاہت،

مادی منفعت، زر و زمین کی بہتات، اور عہدہ و منصب جیسی عارضی چیزوں کے مقابلے میں، ہمیشہ ایمان، عمل صالح اور صدق و اخلاص جیسی ابدی چیزوں کو ترجیح دیں اور لوجہ اللہ، صبر و عزیمت کے ساتھ تا عمر اِسی راستے پر گام زن رہنے کی جد وجہد جاری رکھیں۔

نئی پیش رفت کی ضرورت

موجودہ حالات میں ضرورت ہے کہ دیگر متعلق صلاحیتوں کے حامل افراد مروجہ اور مخصوص قسم کے نظریاتی موضوعات پر کام کے ساتھ ساتھ، انسانیت کو درپیش اُن دوسرے علمی، فکری اور عملی امور کو بھی اپنے کام اور تحقیق کا موضوع بنائیں جو اِس عہد نو، خصوصاً مابعد کورونا (Post-Corona) دور میں پوری انسانیت کے سامنے مزید شدت کے ساتھ ابھر کر آ گئے ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانے میں خود دوا اور بنیادی غذائی اشیا میں پیدا کردہ عظیم فساد (GMOs) اور دیگر خلاف فطرت سرگرمیوں کی بنا پر 'تغییر خلق' (النساء ۴: ۱۱۹) کا مہلک ترین چیلنج انسانیت کو درپیش ہے۔ اِس کے ذریعے سے عملاً ہر سطح پر انسان کو غیر انسان بنائے جانے (dehumanization) کا عمل انتہائی تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرانس ہیومن ازم (trans-humanism) یا ماورائے انسانیت دور میں اب بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ بطور انسان غالباً یہ ہماری آخری صدی ہو گی۔

مشہور برطانوی سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ (وفات: ۲۰۱۸ء) نے اِس خطرے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'مشینی ذہانت' کا یہ لامتناہی ارتقا خود انسانی نسل کے خاتمے کی قیمت پر ہو گا:

The development of full artificial intelligence could spell the end of the human race. [The Economic Times, March 14, 2018]

'تغییر خلق' کے اِن نامطلوب فسادات کے نتیجے میں نہ صرف مہلک بیماری اور عدم تغذیہ کا ناقابل تلافی بحران پیدا ہو گیا ہے، بلکہ اِس فساد کے ذریعے سے خود اُس جوہر فطرت اور روح آدمیت ہی کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جو وحی اور رسالت کی اصل مخاطب ہے۔ لہٰذا ہمیں غور کرنا چاہیے کہ جب خود انسان انسان نہ رہے، اُس وقت کوئی ربانی دعوت کس طرح موثر ثابت ہو سکتی ہے؟ ایسی حالت میں، یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ دوسرے مطلوب کاموں کے ساتھ، اِس وقت ہمارا اولین ترجیحی کام کیا ہونا چاہیے۔

ایسی حالت میں، صرف بال و ناخن کے مسائل، تطہیر بدن کے احکام، ازدواجی عمل کے شرعی حدود، ڈاڑھی و

پردہ کے آداب اور خواجہ سراؤں کے حقوق جیسے مباحث کی مسلسل تکرار کے بجائے، ضرورت ہے کہ قرآنی رہنمائی کے تحت، انسانیت کو درپیش دوسرے بہت سے اہم علمی اور عملی مسائل کو اپنا موضوع بنایا جائے۔ مثلاً: صنفی انارکی، ازدواجی بحران، سرمایہ دارانہ جبر و استحصال، ماحولیاتی آلودگی، موسمی تبدیلی، گلوبل وارمنگ، مسکرات اور منشیات کا سرطانی پھیلاؤ اور تمام بنیادی اشیاے خورونوش، حتیٰ کہ پانی اور ہوا جیسی عمومی اشیا کو مہلک کثافت اور کیمیائی فساد سے بچا کر پاکیزہ اور صحت بخش بنانے کا عملی حل، موبائل ایڈکشن، سوشل میڈیا سنامی، حقیقی دنیا کے بجائے مفروضہ دنیا (virtual world) کا چیلنج جس نے اصل معرکۂ حیات سے کاٹ کر آج کے 'ترقی یافتہ' آدمی کو غیر آدمی (dehumanised) بنا کر رکھ دیا ہے۔ اِسی طرح حقیقی زندگی (real life) کے بجائے فرضی زندگی (reel life) کے عظیم بحران کا چیلنج، وغیرہ۔

کثیر لسانی اور کثیر الفنون صلاحیت کی ضرورت

اِس کام کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے اندر باقاعدہ طور پر کثیر لسانی اور کثیر الفنون صلاحیت (multilingual & multidisciplinary efficiency) پیدا کریں۔ مثلاً قدیم مذہبی صحائف کی اصل زبانوں میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں سے، کسی ایک یا تمام سطحوں کی صلاحیت پیدا کی جائے — عبرانی، ارامی، یونانی اور سنسکرت، وغیرہ؛ نیز عربی و فارسی کے ساتھ جرمن، ترکی، لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی، وغیرہ۔ اِس سے اُن کا ذہنی افق مزید وسیع ہوگا اور وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ متعدد فکری ابعاد اور مختلف علمی جہات سے واقعات کا بھرپور تجزیہ کر سکیں گے۔ اِس ضروری استعداد کے بغیر اِس زمانے میں، صرف مروجہ قسم کے محدود ذہنی اور علمی پس منظر کے ساتھ تجدید و احیاے اسلام کا نازک کام مطلوب صورت میں انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اِن ضروری 'آلات' کے بغیر نہ تاریخ کی عمیق برماکاری (deep drilling) کا وہ عمل ممکن ہے جو اصل حقائق کو بے نقاب کر سکے، اور نہ چودہ صدیوں پر محیط عظیم فکری اور علمی ملبے کے نیچے دفن بہت سے خزائن و باقیات تک رسائی ممکن نظر آتی ہے۔ اِس معاملے کی اہمیت کا شعور اگر بیدار ہو جائے تو اچھا ذہن اور قوت حافظہ رکھنے والے طلبہ کے اندر اِس قسم کی کثیر لسانی اور کثیر الفنون صلاحیت پیدا کرنا کوئی مستبعد شے نہیں۔ غالباً اِسی طرح کے بہت سے خزانوں کو دیکھ کر اقبال نے ایک صدی قبل یہ صدا لگائی تھی:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

المورد کی استثنائی نوعیت

الحمدللہ، اب تک المورد کے تحت کئی اسلامی موضوعات پر اہم ترین علمی اور تحقیقی کام کیا جا چکا ہے۔ اِس کام کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہو گا کتاب و سنت۔ مرکزی تصور دین کے اِحیا و تجدید کی عالمانہ جد و جہد۔ تاہم، اب اِسی کے ساتھ 'لائف کوچنگ' (Life Coaching) کے اہم ترین عصری اور انسانی موضوعات پر بھی المورد کے احباب: جناب معز امجد، جواد احمد غامدی اور ڈاکٹر شہزاد سلیم جیسے سنجیدہ اور علم دوست افراد کے ذریعے سے انتہائی قابل قدر کام انجام پا رہا ہے۔

میرے علم کے مطابق، المورد اپنے فکر و مقاصد کے اعتبار سے، معروف معنوں میں نہ محض ایک روایتی قسم کا ادارہ ہے اور نہ اُس کے سنجیدہ اور ذی علم و صاحب فکر احباب میری طرح صرف مدرسے کے فارغ التحصیل ایک مولوی۔ المورد اپنے نظم و معیار، برتر اخلاقیات، ذوق جمال، اعلیٰ ادبی مذاق، علمی اور فکری وسعت، اور رفقائے کار کے جدید عصری اور اسلامی، دونوں پس منظر رکھنے کی بنا پر شاید دوسرے بہت سے اداروں کی بہ نسبت زیادہ اِس پوزیشن میں ہے کہ وہ اپنے پیش نظر دوسرے اہم مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ، وقت کے حقیقی اور زندہ مسائل کو زیادہ بہتر طور پر ایڈریس کرے۔ اِس طرح المورد کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ وہ استاذ جاوید احمد غامدی کے اِس عظیم خواب کی تعبیر بن سکے:

اِس زمانے کو بھی دیں اور زمانہ کوئی
پھر اُٹھیں، ولولۂ علم و ہنر تازہ کریں!

بعض مرتبہ عالمی پلیٹ فارم پر روایتی اور فرسودہ و غیر متعلق قسم کے مباحث اور لاحاصل فنی قیل و قال کی تکرار مسلسل دیکھ کر اکثر یہ خیال آتا ہے کہ جن چیزوں پر فراہی سے لے کر غامدی تک کے جلیل القدر اہل علم مسلسل لکھتے اور بولتے رہے ہیں، جدید بحرانی حالات میں بھی اُنھی مباحث پر اکتفا کر کے صرف چند مخصوص موضوعات پر بحث و تمحیص شاید اپنے وقت اور توانائی کا زیادہ بہتر استعمال نہیں۔ تاریخ کا فیصلہ ہرگز ہمارے متعلق وہ نہیں ہونا چاہیے جسے اقبال نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

ہمیں شعوری طور پر اِس ابدی حقیقت سے باخبر رہنا چاہیے کہ ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی بہت سے پتھر الٹنا، بہت سی وادیاں طے کرنا اور بہت سی اُن دیواروں کا انہدام باقی ہے جو خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان ایک مقدس 'ابدی چٹان' بن کر مسلسل طور پر حائل ہیں:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ، دررگِ تاک است!

اِس صورت حال کو دیکھ کر بسا اوقت دل چاہتا ہے کہ اِس قسم کے مخلص اور باصلاحیت احباب سے اقبال کی زبان میں، غالب کے اِن معذرت خواہانہ اشعار کے ساتھ، عرض کیا جائے کہ:

میں جو گستاخ ہوں، آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم، ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالب، مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!

شاعر حقیقت علامہ اقبال کی یہ نواے سروش ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

اے اہل نظر، ذوقِ نظر خوب ہے، لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا!؟
آتی ہے دمِ صبح صدا عرش بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک!
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک!
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

مروجہ روایات کی حمالی

واقعات کا گہرا اور بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اٹھنے والے بہت سے عظیم مرتبہ اکابر ائمۂ فن واصول سے لے کر تادم تحریر، ہمارے اکثر افراد صرف مروجہ فنی، فقہی، کلامی، اصولی، اکتشافی اور رہبانی دنیا کے صحرا نوردا اور 'قرون مشہود لہا بالخیر' کے بعد جاری تکییف (conditioning) کے تحت قائم اِجماع و تواتر کے اُس عظیم فکری اور مذہبی پشتارہ کی بے لوث 'حمالی' (الجمعہ ۶۲: ۵) پر مامور رہے ہیں جس کے بیش تر حصے کو اللہ اور رسول کا استناد حاصل نہیں۔ جو شخص یا گروہ تاریخ کی حمالی کے اِس بوجھ اور بصیرت کش تکییف کی اِس سیاہ دھند سے آزاد ہو کر روشن ضمیری اور بلند نظری کے ساتھ سوچنے کا حوصلہ رکھتا ہو، تاریخ کی امامت اب اُسی کا مقدر ہو گی:

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے!
موت کے آئنے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے!

تاریخ کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہمارے درمیان عام، متداول اور رائج اخباری روایت پر مبنی اِس پشتارے کا تانا بانا اکثر قرآنی اور نبوی منہاج کے بجاے 'لتتبعنّ سنن من كان قبلكم...' (بخاری، رقم ۳۴۵۴۔ مسلم، رقم ۲۶۶۹) اور 'ليأتينّ على أمتي، ما أتى على بني إسرائيل، حذوَ النعل بالنعل...' (ترمذی، رقم ۲۶۴۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۴۴) جیسی عظیم پیغمبرانہ اور چشم کشا پیشین گوئی کے مطابق، قدیم مذہبی 'تہوید، تنصیر اور تمجیس' (...فأبواه يهودانه، أو ينصرانه، أو يمجسانه. بخاری، رقم ۱۳۸۵) پر قائم رہا ہے۔

چناچہ اِس 'دین غریب' (إن هذا الدين بدأ غريبًا، وسيعود غريبًا كما بدأ. تخريج العواصم والقواصم، شعيب الأرنؤوط ۷/۳۰۹۔ مسلم، رقم ۱۴۵) کا حال یہ ہے کہ اِس کا بڑا حصہ قرآنی اور نبوی فقہ اور ایمان و حکمت سے زیادہ، اِسی مذکورہ 'مذہبی پشتارہ' سے مستفاد اور اِنھی کھوٹے اور کم عیار جوہرات سے مالامال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس خرمن مستعار کی خاکستر میں اکثر نبوی فقہ و تفقہ (التوبہ ۹: ۱۲۲)، ایمان و اخلاق اور معرفت حق (المائدہ ۵: ۸۳) کے سوا، اور سب کچھ پایا جاتا ہے (فيه كلّ شيءٍ إلا الفقه

والإیمان)۔

ہمارے اکثر متعربین و متغربین اور قدیم و جدید جامعات کے فارغین، اِسی زنداں کے اسیر اور اِسی مابعد عہد رسالت تکییف (Post- Prophetic Conditioning) پر قائم اُس شاکلے کی تقلید محض پر مجبور دکھائی دیتے ہیں جسے 'خلافت علیٰ منہاج النبوہ' (۶۳۲ء-۶۶۱ء) کے بعد 'دین فطرت' اور 'دین سماحت' (بعثتُ بالحنیفیة السمحة) کی جگہ 'اِصر و اَغلال' (الاعراف ۷: ۱۵۷) پر مبنی ایک نئے احباری اور رہبانی 'مذہب' کے طور پر رائج کیا گیا۔ اقبال نے درست طور پر کہا تھا:

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار

یہ اِسی عظیم فساد کا نتیجہ تھا کہ علماے حق گم نام، مطعون اور اکثر غیر موثر رہے اور ہمارے درمیان اصل فیصلہ کن عامل و بنیاد کی حیثیت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بجاے عملاً صرف 'مذہبی' قیادت کو حاصل ہو گئی، اور 'کتاب و سنت' دونوں بالآخر اُنھی کی تائید و تصویب پر منحصر ہو کر رہ گئے۔

چنانچہ عملاً یہ ہوا کہ مقتدیٰ اور میزان و فرقان کا وہ مقام جو صرف اللہ اور رسول کے لیے مخصوص تھا، وہ 'مذہبی علماے اصول' کو عطا کر دیا گیا۔ دین اللہ میں اِس فساد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل 'قاعدہ' (کتاب و سنت) میں تحریف کا یہ عمل اِس معاملے میں گویا اُس بدنام زمانہ 'القاعدہ' کے ہم معنی بن گیا جو عملاً ایک ایسی فکری دہشت گردی ثابت ہوا جس کے نتیجے میں آزادانہ تحقیق کا دروازہ بند ہو گیا۔ چنانچہ اِس بحرانی صورت حال نے دین اللہ کے پورے ڈھانچے کو عملاً ڈائنامائٹ کر کے رکھ دیا۔

ظاہر ہے کہ جس نظام فکر میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بجاے 'احبار اور رہبان' (التوبہ ۹: ۳۱) دین اللہ کے لیے میزان اور فرقان بن کر 'شارع اسلام' کے منصب پر فائز کر دیے جائیں تو پھر اِس زمین و آسمان کے نیچے اِس سے بڑا فساد اور کیا ہو سکتا ہے: 'وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ'! ؟ (العنکبوت ۲۹: ۶۸)۔

چنانچہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ حال ہوا کہ ہمارے اکثر ارباب علم باجبہ و دستار اِسی مابعد رسالت چھیڑے

ہوئے ساز پر رقص کناں، اِسی کے صغریٰ و کبریٰ کی تنقیح اور اِسی کے متعین کردہ منہج و خطوط کی بنیاد پر انتہائی سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ دادِ تحقیق دینے میں شب و روز مصروف رہے۔ تاہم اِس کے باوجود انسانیت عامہ اور ملت اسلامیہ کا قافلہ دن بدن 'ھدیٰ' (البقرہ ۲: ۱۲۰) وصلاح کے بجائے 'ھویٰ' (القصص ۲۸: ۵۰) وفساد کی طرف بڑھتا رہا اور اِس طرح، بالفاظ قرآن، عملاً یہ ہوا کہ 'اصلاح' (البقرہ ۲: ۱۱) کے بجائے گویا صرف 'فی سبیل اللہ فساد' (البقرہ ۲: ۱۲) کا رول ہمارا مقدر بن کر رہ گیا۔

یہ تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ اب ہمارے اکثر ادارے اپنے مخصوص خول میں بند ہو کر عملاً صرف ایک قیمتی دارالاشاعت اور ایسے دارالتراجم بن چکے ہیں، جہاں سے شائع ہونے والے لٹریچر کا بڑا حصہ، اپنی تمام ترافادیت کے باوجود، اصل علمی اور فکری سوالات کا جواب، انسانیت کے زخم کا مرہم، اُس کے درد کا درماں اور اُس کو درپیش مسائل کے حل وادراک سے یکسر خالی نظر آتا ہے۔

چنانچہ اب یہاں ایسے لکھنے اور بولنے والوں کی کثرت ہے کہ ''ابن مریم'' کے مقام پر فائز ہونے اور مسیحائی کا مقدس لبادہ اوڑھ لینے کے باوجود اُن کے پاس انسانیت کے درد کی کوئی دوا نہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چنانچہ ہمارے درمیان اب عملاً ایسی سرگرمیاں جاری ہیں جو محض قومی اور زوال یافتہ و بے روح مذہبی فکر و مراسم کی نمایندہ ہیں۔ اِن میں سے اکثر سرگرمیاں نہ انسان رخی (human-oriented) ہیں اور نہ اِن میں انسانیت عامہ کی بھلائی اور اُس کی فلاح کا کوئی سنجیدہ اور واقعی پروگرام نظر آتا ہے۔

خلاصۂ کلام

اب حالات کا تقاضا اور وقت کی پکار یہی ہے کہ نبی امی علیہ السلام کے سچے امتیوں میں ایسے خالص اور مخلَص امیین (مابعد رسالت تکییف سے خالی افراد) اُٹھیں جو اِس خرمن مستعار کی خاکستر سے ایک نئی دنیا پیدا کریں،

جو بے حسی اور مبتدعانہ روایت پرستی کا یہ طلسم توڑ کر دنیا کو علم، زندگی اور محبت کا تحفہ دے سکیں، جو اِس ’عالم ایجاد‘ میں ’صاحب ایجاد‘ بن کر کتاب و حکمت، عقل و فطرت اور پیغمبرانہ ہدایات پر مبنی ’علم و ایمان‘ (الروم ۳۰: ۵۶) اور ’ربانیت و حسن اخلاق‘ (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳-۳۹) کی وہ عالم گیر دعوت، صداے لاہوتی اور وہ ’نغمۂ جبرئیل آشوب‘ بلند کر سکیں جو صدیوں سے جاری اِس احباری تقدس اور اِس فکری جمود کے لیے ایک ’ضرب کلیم‘ ثابت ہو اور جس سے عالم افکار میں ایک ایسا زلزلہ برپا ہو جس کا آج شاید زمین و آسمان کو سب سے زیادہ انتظار ہے۔ یہ علمی، ایمانی، اخلاقی اور ربانی زلزلہ گویا صور اسرافیل سے پہلے ایک عظیم فکری بھونچال کے ہم معنی ہو گا:

دنیا کو ہے، اُس مہدیِ* برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار!

اِس سمع خراشی اور طویل جگر کاوی کے بعد اب آپ کا یہ ظلوم و جہول دوست حافظ شیرازی (وفات: ۱۳۹۰ء) کے اِس شعر کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتا ہے:

بال بگشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی!

(لکھنؤ، ۱۵/ ستمبر ۲۰۲۰ء، نظر ثانی: اپریل ۲۰۲۴ء)

---

* یہاں ’مہدی‘ کا لفظ معروف اصطلاحی مفہوم میں نہیں، بلکہ یہ اپنے وسیع تر معنوں میں ایک بلیغ ادبی تلمیح کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے، یعنی مابعد رسالت تکییف سے خالی انسان۔

شاہد رضا

اچھے اعمال والے غیر مسلم

[جناب جاوید احمد غامدی کی تحریروں، آڈیوز اور
ویڈیوز سے اخذ واستفادہ پر مبنی سوال وجواب]

سوال: اچھے اعمال والے غیر مسلموں کے ساتھ آخرت میں کیا معاملہ ہو گا؟

جواب: قرآن مجید نے ایک واضح جواب دے دیا ہے کہ اس دنیا میں لوگ تین طرح کے ہیں:

ایک وہ لوگ ہیں جن تک کسی پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی۔ نہ صرف ان تک نہیں پہنچی، بلکہ ان کے آباواجداد کو بھی کسی پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں ان سے اتنا ہی حساب لوں گا جتنا علم میں نے ان کی پیدایش کے ساتھ ان کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔ یعنی انسان اندھا اور بہرا پیدا نہیں ہوا، بلکہ وہ اخلاقی شعور اور ذات خداوندی کا شعور لے کر پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۷۲-۱۷۴ میں اس کو موضوع بنا کر بتایا ہے کہ ایسے بہت سے لوگ قیامت میں اٹھیں گے جو کہیں گے کہ اے پروردگار، ہم تک تو کسی پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی، ہمارے تو آباواجداد کو بھی کسی پیغمبر نے اپنا پیغام نہیں پہنچایا تو ہمیں کس بات کی سزا ہے؟ تو ان سے کہا جائے گا کہ وہ جو عہد میں نے تم سے لیا تھا اور وہ تمھارے اندر موجود ہے، میں اس کی بنیاد پر تمھارا مواخذہ کر رہا ہوں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن تک پیغمبروں کی دعوت پہنچ گئی۔ ان کے بارے میں بتا دیا گیا ہے کہ جو پیغمبروں کی تعلیم ان کو ملی ہے، اس کی بنا پر وہ جواب دہ ہوں گے، اس لیے کہ ان تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچ گیا۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جن تک آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچ گئی، ان پر حق واضح ہو گیا، ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ خدا کی بات ہے اور انھوں نے اس کا اقرار کیا یا انکار کیا۔ ان سے اس کے بارے میں سوال ہو گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انصاف کی بنیاد پر لوگوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔ جب آپ 'غیر مسلم' کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ابھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے یہ سوال ہو گا کہ انھوں نے آپ کو کیوں نہیں مانا؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم پر یہ حق تو واضح ہو گیا تھا اور ہمیں معلوم تو ہو گیا تھا کہ آپ خدا کے پیغمبر ہیں، مگر ہم نے جانتے بوجھتے انکار کر دیا تو پھر تو وہ بڑے مجرم ہیں۔ اگر کوئی آدمی کہتا ہے کہ مجھے تو بات پہنچی ہی نہیں، میری تو سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا، مجھے تو مسلمانوں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ کوئی قابل تقلید لوگ نہیں ہیں۔ یہ وہ عذر ہیں جنھیں ان کا پروردگار چاہے گا تو قبول کر لے گا۔ قرآن نے جو اصول بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ جس کے پاس جتنا علم ہے، اس کے لحاظ سے اللہ اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

لہٰذا غیر مسلموں کے ساتھ بھی اسی اصول کے مطابق معاملہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری اقسام (categories) کے مطابق معاملہ نہیں کریں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو اصول بنائے ہیں، انھی کے مطابق معاملہ کریں گے۔[1]

غیر مسلم کو مسجد میں عبادت کی اجازت

سوال: کیا غیر مسلموں کو مساجد میں عبادت کی اجازت دی جا سکتی ہے؟

جواب: کسی غیر مسلم کو شرک کے لیے تو مسجد نہیں دی جا سکتی، کیونکہ مسجد توحید اور اللہ کی عبادت کی جگہ ہے۔ ایک مسیحی یا یہودی اللہ کی عبادت اپنے طریقے پر کرنا چاہتا ہے تو وہ مسجد میں کر سکتا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا، یعنی اللہ کی عبادت اپنے طریقے پر۔ ہم مسلمان اللہ کی عبادت کرتے ہیں، جس طرح ہمارا نماز پڑھنے کا ایک طریقہ ہے، اسی طرح ان کا بھی ایک طریقہ ہے۔ چنانچہ اگر

1-https://ghamidi.com/videos/fate-of-non-muslims-with-good-deeds-2340

غیر مسلم مسجد میں آکر صلیب گاڑ دیں یا سیدہ مریم علیہا السلام کی تصویر رکھ دیں تو اس کے لیے ان سے معذرت کی جائے گی اور انھیں مسجد نہیں دی جائے گی، کیونکہ ہمارے ہاں شرک کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن ہر شخص کو اپنے طریقے کے مطابق اللہ کی عبادت اور اس کی بندگی کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ عبادت مسجد میں کرنا چاہیں تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں اس کی اجازت دی ہے (الطبقات الکبریٰ ۱/ ۳۵۷)۔[۲]

۲-https://ghamidi.com/videos/can-nonmuslims-be-allowed-to-worship-in-the-mosque-3099

محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۱)

باب ۱۱

گاؤں میں منتقل ہونے کا مسئلہ

امین احسن لاہور میں ایک کرایے کی کوٹھی میں اقامت پذیر تھے۔ دوسرے اخراجات بھی بہت زیادہ تھے۔ شہری زندگی کے رکھ رکھاؤ پر بھی بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ بڑے بیٹے ابو صالح کی وفات سے گھر کی مالی ذمہ داریاں بھی ان کے ناتواں کندھوں پر آن پڑی تھیں۔ پھر ان کی بیماری کے اخراجات نے انھیں خاصا مقروض کر دیا تھا۔ ان کی معاشی حالت پہلے بھی مستحکم نہ تھی۔ پھر وہ معاش کو اہمیت دینے کے بالکل قائل نہیں تھے۔ قرآن مجید کی رو سے ان کا ایمان تھا کہ آدمی کو فکر صرف اپنا فرض ادا کرنے کی ہونی چاہیے۔ اگر وہ اخلاص کے ساتھ اس میں منہمک ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس کی کفالت کی ایسی راہیں خود کھول دے گا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گی۔ اگر اس راہ میں کچھ آزمایشیں پیش آتی ہیں تو ان کا مقصد انسان کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔

امین احسن کی دوسری اہلیہ محترمہ کے والد چودھری عبد الرحمٰن جالندھر کے قریب ایک گاؤں راہوں کے ایک بڑے زمین دار تھے۔ تقسیم ہند کے بعد چودھری صاحب کو بدلے میں مختلف مقامات پر زمین الاٹ کی گئی۔ امین احسن کی گزر اوقات اس زمین کی پیداوار سے ہوتی تھی جو ان کی اہلیہ کے حصے میں آئی تھی، مگر اس کی آمدنی بھی اخراجات کی مقابلے میں کم تھی۔ امین احسن کے عزیز دوست سردار محمد اجمل خان لغاری نے یہ زمین

اشتمال اراضی کے ذریعے سے یکجا کرادی تو اس کا انتظام آسان ہو گیا۔ پہلے زمین پر کاشت اور پیداوار پر ذاتی توجہ نہ ہوتی۔ یہ معاملات منشی کی زیر نگرانی ہوتے، جس کی وجہ سے یافت کم رہتی۔ اس کے باوجود امین احسن نے کہا کہ لاہور میں گزارا نہیں ہوتا، لہٰذا گھر پر غور ہوا کہ کیوں نہ اسی زمین پر رہایش اختیار کر لی جائے، مگر امین احسن سوچتے تھے کہ اس منتقلی سے ایک تو لاہور میں قرآن کی تدریس کا کام بالکل معطل ہو جائے گا، اور دوسرے یہ کہ وہ اہلیہ کی زمین پر انحصار کر کے اپنی ذمہ داری بیگم صاحبہ کو منتقل کرنے والے کہلائیں گے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ شیخ سلطان احمد سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ آپ کا ذاتی اور خانگی معاملہ ہے، اس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ امین احسن کا خیال تھا کہ اس طرح میں نان و نفقہ کی ذمہ داری اپنی اہلیہ کے اوپر ڈالنے والا بن جاؤں گا۔ شیخ سلطان صاحب نے اس کے خلاف دلیل دیتے ہوئے کہا کہ آپ وہاں فارغ تو نہیں بیٹھیں گے۔ آپ زمین داری کے تمام معاملات خود سنبھالیں گے۔ اس طرح منشیوں کے تقرر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کاشت کی منصوبہ بندی اور نگرانی آپ خود کریں گے۔ اس میں آپ کا وقت اور محنت صرف ہو گی۔ آپ اس کا معاوضہ پانے کے حق دار ہوں گے۔ پھر زمین سے جو یافت ہو گی، اس میں آپ کا ذاتی حصہ اچھا خاصا ہو گا۔ یوں آپ اہلیہ سے نان و نفقہ پانے کے الزام سے بری ہوں گے۔ یہ دلائل سننے کے بعد امین احسن مطمئن ہو گئے۔

زندگی کے اس موڑ پر امین احسن کیسے حالات سے دوچار تھے، ان کے خطوط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لاہور سے ۲۳/ دسمبر ۱۹۶۰ء کو سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام لکھتے ہیں:

> ”عنایت نامہ موصول ہوا۔ میں نے یہ فیصلہ تو اس وجہ سے کیا ہے کہ اب اس کے سوا کوئی شکل باعزت گزارے کی نظر نہیں آئی۔ اور یہ بھی ابھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ زمین پر سر چھپانے کے لئے کوئی جھونپڑا بن جائے۔ آج کل میں اسی چکر میں ہوں۔ دعا کیجئے کہ میرا یہ ارادہ پورا ہو مجھے توقع ہے کہ محمود صاحب (مولانا کے برادر نسبتی فضل الرحمٰن محمود صاحب مراد ہیں اس وقت تک مولانا کی اہلیہ کی زمین ان کے ساتھ مشترک تھی۔ مدیر) نے زمین اگر بغیر کسی جھگڑے کے علیحدہ کر دی تو میں دوسری مشکلات پر قابو پا لوں گا، مجھے اپنی زندگی کے اس موڑ پر جو میں بڑھاپے میں کرنے پر مجبور ہوا ہوں اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ سہارا پانے کی جس سے توقع ہے وہ آپ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے مشوروں سے میرا حوصلہ بڑھاتے رہیں گے۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷۸)

لاہور سے ۲۲؍اگست ۱۹۶۷ء کو بنام محمود احمد لودھی صاحب لکھا:

’’اب میں اکتوبر تک لاہور چھوڑ کر رقبے پر منتقل ہونے کی اسکیم بنا رہا ہوں۔ پیش نظر مصارف کی تخفیف ہے۔ ابھی یہ ارادہ چند دوستوں تک راز ہے اور وہ بھی اس پر مطمئن نہیں ہیں لیکن میں اس کو ذاتی پہلو سے مفید بلکہ ضروری سمجھتا ہوں۔ توقع ہے کہ اس سے مصارف میں تخفیف ہو گی۔ قرض میں اضافے کا سلسلہ رک جائے گا اور ادائے قرض کے لئے کچھ پس انداز ہو سکے گا۔ علمی اور تعلیمی مقاصد ضرور متاثر ہوں گے لیکن تفسیر کا کام امید ہے جاری رہ سکے گا۔ اب اس عمر میں ذہنی سکون ضروری ہے جو بحالتِ موجودہ میسر نہیں۔ لاہور اچھی جگہ ہے مگر میرے جیسے شخص کے لئے اس کا رکھ رکھاؤ گراں بلکہ ناقابل برداشت ہے۔‘‘

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۳)

لاہور سے ۲۰؍جون ۱۹۶۳ء کو سردار محمد اجمل خان لغاری کے نام بیان کرتے ہیں:

’’آپ مجھے دیہات اور دیہاتی زندگی سے نہ ڈرایئے میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ خالص دیہات میں بسر کیا ہے اور بڑی غریبانہ زندگی گزاری ہے۔ اب بھی گو میں لاہور میں رہتا ہوں لیکن ایک بالکل طالب علمانہ زندگی رکھتا ہوں۔ بس مشکل یہ ہے کہ میری علمی زندگی کے تقاضے مجھے لاہور کے قیام پر مجبور کرتے ہیں اور معاشی ضروریات ٹبی بھیکو (مولانا کے گاؤں رحمان آباد کا پرانا نام۔ مدیر) سے باندھے ہوئے ہیں کشمکش یہ ہے کہ نہ پیٹ کو لپیٹ سکتا نہ روح کو کچل سکتا۔ اب دیکھئے رب کریم میرے لئے اس کشمکش سے عہدہ برآمد ہونے کی کیا راہ نکالتے ہیں۔‘‘ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۱)

لاہور سے ۲۳؍جنوری ۱۹۷۳ء کو بنام ڈاکٹر عبداللطیف خان لکھا:

’’اب میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ لاہور چھوڑ کر ایک دیہات میں چلا جاؤں۔ وہاں میری بیوی کا ایک مختصر رقبہ زمین ہے۔ اس پر ایک جھونپڑا بنا کر بقیہ زندگی وہیں گزارنے اور جب تک قوت ساتھ دے تفسیر لکھنے کا ارادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں اب میری دلچسپی کی کوئی چیز نہیں رہی۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کی معیت میں جو کام شروع کیا تھا اس کو انھوں نے بالکل تلپٹ کر کے اپنا ذاتی کام بنالیا ہے اور نہ میں ان کو سمجھانے میں کامیاب ہو سکا اور نہ میرے دوسرے ثقہ اور ذی علم احباب اس میں کامیاب ہو سکے۔ اس وجہ سے ہم سب نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

میں لاہور میں اسی کام کی خاطر اٹکا ہوا تھا ورنہ یہاں کی کثیر المصارف زندگی میرے تحمل سے باہر تھی۔

چنانچہ میں قرض دار بھی ہو گیا۔ یہاں میری کوئی ذاتی آمدنی نہیں ہے۔ میری کتابیں بھی میرے لیے کسی دنیوی منفعت کا ذریعہ نہیں بنیں اور اب تو ڈاکٹر صاحب ان پر اس طرح مسلط ہونے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مستقبل میں بھی ان سے مجھے کسی فائدے کی امید نہیں۔ میرا گزارہ یا تو زمین کی آمدنی سے ہو رہا تھا یا آپ مدد فرماتے تھے۔ زمین کی آمدنی بس اتنی ہے کہ زمین پر رہ کر تو اس سے روٹی کھا سکتا ہوں لیکن لاہور شہر کے مصارف اس سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے اب میرے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہیں چلا جاؤں۔ وہاں امید ہے کہ تفسیر کا کام زیادہ اطمینان سے کر سکوں گا۔ یہاں بہت سا وقت لوگوں سے ملنے جلنے میں بھی صرف ہو جاتا ہے۔

میری کتابوں کے چھپنے کا معاملہ اب بالکل مجہول ہو گیا۔ میرے پاس ایسے ذرائع نہیں کہ میں ان کو چھپوا سکوں اور ڈاکٹر صاحب پر مجھے اعتماد نہیں رہا۔ اس وجہ سے اب اس معاملے کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ اگر اس کی مرضی ہو گی تو ان کے چھپنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی ورنہ اپنے رب کے فیصلہ پر راضی ہوں۔ البتہ لکھنا میری ذمہ داری ہے اور یہ کام میں آخر دم تک ان شاءاللہ کرتا رہوں گا چونکہ آپ اس کام کے سب سے بڑے معاون اور قدر دان ہیں اس وجہ سے آپ کو آگاہ کرنا ضروری ہوا۔“(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۰)

گاؤں میں قیام

بیگم امین احسن صاحبہ کی زمین ضلع شیخوپورہ کے قصبے خانقاہ ڈوگراں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ گاؤں کی آبادی بہت مختصر تھی۔ امین احسن نے اس کا نام اپنے سسر کے حوالے سے رحمٰن آباد رکھا۔ گاؤں شہری سہولتوں سے بالکل محروم تھا۔ بجلی نہیں تھی۔ مکانات کچے تھے۔ گلیوں میں گائیں بھینسیں بندھی ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوتے تھے۔ مکھیوں اور مچھروں کی بھرمار تھی۔ آبادی ان پڑھ تھی۔ امین احسن کی علمیت کی قدر کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود امین احسن کو دیہی زندگی سے بے حد انس تھا۔ انھوں نے زمینوں کی دیکھ بھال بڑی جاں فشانی سے کی۔ ان کا معمول یہ تھا کہ نماز فجر اور پھر نماز عصر کے بعد رقبے پر جاتے۔ کاشت کی نگرانی کرتے۔ کسانوں کو بر سر موقع ہدایات دیتے۔ ایک ایک بوٹے پر توجہ دیتے۔ نہری پانی ملنے کی باری اگر رات کے وقت ہوتی تو رات کو اٹھ کر رقبہ پر جاتے۔ گاؤں کی زمین کینو کے لیے موزوں پائی تو بڑے اہتمام سے کینو کے دو باغ لگوائے۔ یہ محنت اور منصوبہ بندی باثمر ہوئی۔ زمین کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

امین احسن رقبے پر آنے جانے سے تفسیری مشکلات حل کرنے کا کام بھی لیتے تھے۔ جو کچھ انھوں نے لکھنا ہوتا تھا، اس کا اسلوب متعین کرنے کے لیے وہ سیر کا وقت بڑا موزوں خیال کرتے تھے۔ سورۂ کہف میں ہے کہ ایک باغ والے کا باغ درختوں سے گھرا ہوا تھا اور بیچ بیچ میں کاشت کی جاتی تھی، امین احسن نے ایک ایسا ہی اپنا باغ بنایا۔ زمین کے ارد گرد شیشم کے درخت لگوائے، درمیان میں کینو کے پودے اور ان کے بیچ کی زمین میں کاشت کی جاتی تھی۔ امین احسن باغ میں داخل ہوتے تو پڑھتے 'ماشاء اللّٰہ لا قوۃ إلا باللّٰہ' (جو کچھ اللہ نے چاہا، عطا فرمایا، اللہ کے بغیر ہماری کوئی طاقت نہیں)۔ یوں اپنی عبودیت اور ممنونیت کا اقرار اور اظہار کرتے۔

گاؤں جانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ شہری مصروفیات سے چھٹکارہ مل گیا۔ تفسیر کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ امین احسن نماز فجر کے بعد رقبے کا چکر لگا کر واپس آتے، ناشتہ کرتے اور گاؤں سے متصل واقع دیہی کونسل کی عمارت میں چلے جاتے۔ وہاں کسی شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر تفسیر لکھتے۔ یہ تفسیر اس غور و فکر کا نتیجہ ہوتی جو انھوں نے سحری کے وقت کیا ہوتا تھا۔ قیلولہ کے بعد اگلی آیات پر غور کرتے۔ عصر کی سیر کے دوران میں ان کے نکات پر غور کرتے۔ بعض اوقات آیات کا نظم یا کسی مضمون کو ادا کرنے کا اسلوب سمجھ میں نہ آتا تو کئی روز تک غور و فکر جاری رہتا اور لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

حلقۂ تدبر قرآن کے رفقا مہینے میں ایک بار ضرور حاضر ہوتے۔ امین احسن اس دوران میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کرتے۔ کوئی بات تحقیق طلب ہوتی تو خالد مسعود صاحب کو اس پر کام کرنے کی ہدایت کرتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ خالد صاحب کو اپنا نقطۂ نظر لکھ کر پیش کرنے کو کہتے۔ جب خالد صاحب اپنی سوچ کے مطابق تفسیر لکھ کر دیتے تو امین احسن خوش ہو کر کہتے کہ تم نے بات کو ٹھیک سمجھا، اس سے مسئلہ حل ہو گیا۔

امین احسن کی اسی زندگی کے بارے میں جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں:

> ''یہ تفسیر لاہور میں بھی لکھی گئی اور برسوں لاہور سے باہر خانقاہ ڈوگراں کے پاس ایک دور افتادہ گاؤں رحمٰن آباد میں سرسے اور شیشم کے درختوں کے نیچے بھی زیر تسوید رہی، جہاں نہ بجلی تھی، نہ پنکھا اور نہ تصنیف و تالیف کے لیے کوئی دوسری سہولت۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ مسودہ پسینے سے بھیگ رہا ہے، لیکن مصنف کا قلم اسی طرح رواں دواں ہے۔ وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ —— بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید —— قرآن کی مشکلوں کو حل کرنے اور اس سے متعلق اپنے نتائج فکر کو سپرد قلم کرنے میں وہ دنیا کی ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے:

طالباں را خستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست و ہم خود منزل ست“[1]

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۱۴)

امین احسن کے شاگردوں کے علاوہ ان کے احباب اور بعض اہل علم بھی کبھی کبھار انھیں ملنے کے لیے گاؤں میں جایا کرتے تھے۔ خالد صاحب جب ملنے کے لیے جاتے تو امین احسن ایسے مہمانوں کا تذکرہ کرتے۔ امین احسن اکرام ضیف کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ جب بھی کوئی مہمان آتا تو وہ بے حد خوش ہوتے اور تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔

امین احسن گاؤں کی مسجد میں جمعہ بھی پڑھاتے تھے۔ ان کا خطبہ مخاطبین کے عین مطابق ہوتا تھا۔ وہ کسانوں کو یہ پیغام دیتے کہ ان کے لیے اپنے رب کو یاد رکھنا بے حد آسان ہے، کیونکہ ایک کسان بیج ڈالنے سے لے کر فصل اٹھانے تک برابر اللہ تعالیٰ ہی سے امید رکھنے والا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسان اس حقیقت کو فی الواقع دل میں جگہ دے لیں تو وہ اللہ کے ہاں بڑا مرتبہ پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ امین احسن وہاں کے جھگڑے نمٹانے میں بھی دل چسپی لیتے تھے۔ وہ غریبوں کا بڑا ساتھ دیتے تھے۔

گاؤں میں امین احسن کیسے کیسے حالات سے گزرتے تھے، ان کے خطوط بیان کرتے ہیں۔ سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام لکھتے ہیں:

”ایک مربعہ کی خود کاشت شروع کرا دی ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ اپنی معاشی مشکلات میں کچھ سہولت کی راہ نکالوں۔ یہ سہولت تو جب پیدا ہو گی تب ہو گی، اور معلوم نہیں پیدا بھی ہو گی یا نہیں لیکن ایک نسیہ کے پیچھے خاصی نقد مشکلات میں اپنے آپ کو پھنسا لیا ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس مخمصہ سے نکالے اور اٹھایا ہوا قدم واپس نہ لینا پڑے۔ میری نیت بخیر ہے۔ چاہتا ہوں کہ دو روٹی آسانی سے ملتی رہے تاکہ میں اپنی تفسیر لکھ سکوں۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۰)

سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام ہی ایک اور خط:

”میں کل رقبہ پر سے واپس آیا ہوں۔ وہاں مجھے ایک موقع دیکھنے کے لیے کھال (چھوٹی نہر کی شاخ جو کھیتوں میں پائی جاتی ہے) کی اونچی مینڈ پر سے گزرنا پڑا۔ راستہ بالکل ناہموار تھا۔ اس وجہ سے میرا جوتا

۱۔ ”سچے طالبوں کو راہ میں تکان لاحق نہیں ہوتی، اس لیے کہ عشق راہ بھی ہے اور منزل بھی۔“

پھسلا اور میں کھال کے اندر جا پڑا۔ میری بائیں کہنی کا جوڑ اپنی جگہ سے سرک گیا۔ جوڑ وہیں کے ایک آدمی نے بٹھایا لیکن شائد اچھی طرح بیٹھا نہیں۔ اس وجہ سے ابھی تکلیف دور نہیں ہوئی ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اس تکلیف کو دور کرے اور اس کو گناہوں کا کفارہ بنائے۔‘‘

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷۹)

رحمٰن آباد سے ۲۳؍ مئی ۱۹۷۹ء کو بنام محمد احسن خان:

’’اس میں شبہ نہیں کہ ان دنوں گندم کی صفائی ہو رہی ہے جس کی فکر ہمہ وقت ذہن پر سوار رہتی ہے لیکن اس کے باوجود ہو رہے ہیں تو خط بھی لکھا جا سکتا تھا۔ بہر حال اس کوتاہی کی معافی چاہتا ہوں۔

اس وقت میری مشکل بھی کچھ اسی طرح کی ہے جس سے آپ دوچار ہیں۔ انور صاحب سلمہٗ کو حکومت نے ژوب بھیج دیا۔ وہ قریب ہوتے تھے تو زمین داری کی ذمہ داریوں میں ان کی مدد آسانی سے حاصل ہو جاتی تھی۔ اب اس کا امکان نہیں رہا۔ اب عملی نہ سہی لیکن قانونی ذمہ داری تمام تر تنہا مجھ پر ہے۔ اہلیہ بوجہ علالت دو ہفتے سے لاہور میں ہیں۔ یہاں میں تنہا ہوں۔ منشی ہر مسئلہ میں میری رہنمائی چاہتا ہے اور میں فن زمین داری سے جتنا واقف ہوں آپ اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ کتنی گندم رکھنی ہے؟ کتنی بیچنی ہے؟ کس کس کو کتنی دینی ہے؟ کون سی قسم کتنی بیج کے لیے محفوظ کی جائے گی؟ کون سی کھانے کے لیے رکھی جائے گی؟ ابھی ایک مائی بھوسے کی درخواست لے کر آئی تھی۔ نائن شاکی ہے کہ منشی نے اس کو گندم کم دی ہے۔ مزارعوں کا تقاضا ہے کہ ان کی گندم بھی میں اپنی مشین سے صاف کرا دوں۔ نوکروں کو اصرار ہے کہ اب ٹریکٹر خالی ہونا چاہیے تاکہ پنیری لگانے اور دھان کے لیے زمین تیار کرنے کا کام شروع ہو۔ وقت گزر رہا ہے۔

پاکستان کی زرعی ترقی کا حال یہ ہے کہ یہاں تھریشر کے جو پٹے بنتے ہیں، شائد کچے دھاگے یا مٹی سے بنتے ہیں کہ بلا مبالغہ تین دن میں اس کے پرزے اڑ جاتے ہیں۔ اور ان کی قیمت سینکڑوں روپے ہوتی ہے۔ پچھلے سال جو پٹہ خریدا وہ تین دن میں تار تار ہو گیا۔ اس سال نیا خریدا اس کا جو حشر ہوا اس کو کیا عرض کروں! کل بھاری قیمت ادا کر کے نیا پٹہ منگوایا ہے اس پر مہر تو انگلینڈ کی ہے لیکن اصل کیا ہے اس کا اندازہ تجربہ سے ہوگا۔ موسم کا حال یہ ہے کہ ہر روز کچھ چھینٹے پڑ جاتے ہیں جس سے صفائی کا کام ملتوی ہو جاتا ہے اور فکر بڑھ جاتی ہے۔‘‘

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۰)

صحافی اور کالم نگار عطاء الرحمٰن نے لکھا:

’’۷۶-۱۹۷۵ء میں مولانا اصلاحی تنگیِ حالات کا شکار ہو کر اور مقروض حالت میں لاہور سے ضلع شیخوپورہ

میں واقع اپنے گاؤں رحمٰن آباد میں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ تب ان کی ایک آنکھ کا آپریشن ہو چکا تھا۔ گاؤں میں بجلی نہیں تھی۔ مولانا اصلاحی دن کا وقت کھیتی باڑی کے کاموں میں گزارتے اور شام کے دھندلکے میں لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر رات دیر گئے تک اپنی تفسیر مکمل کرنے میں مصروف رہتے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں جب چند میل کے فاصلے پر دنیا بھر کی سہولتیں موجود تھیں قرآن مجید کا یہ بلند پایہ اسکالر خاموشی اور تنہائی کے عالم میں نامساعد معاشی حالات کی وجہ سے کمزور بصارت کے ساتھ لالٹین کی روشنی کی مدد سے آئندہ نسلوں کے لیے قرآن مجید کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر اپنے عمر بھر کے فکر و تدبر کے نچوڑ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں مگن رہتا۔ یہ وہ دور تھا جب ہر وہ شخص جسے علامہ اقبال، مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی تحریریں پڑھ کر عہد حاضر کے اسلوب میں خطابت کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا یا وہ چند قابل اشاعت سطریں لکھنے کے قابل ہو گیا، داعی انقلاب اسلامی بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس کے پاس چندوں کی ریل پیل تھی۔ وہ فراٹے بھرتی گاڑیوں سے لے کر ائیر کنڈیشنڈ کمروں تک کی سہولتوں سے متمتع ہو رہا تھا لیکن علومِ قرآنی کی غواصی کرنے والا یہ درویش صفت اسکالر بے نیازی کے ساتھ صدیوں پرانے ماحول میں بیٹھ کر اکیسویں صدی کے ذہنی معیارات سے مطابقت رکھنے والی تفسیر قرآن لکھتا رہا۔ ۱۹۷۷ میں برادرم ذوالقرنین اور میں مولانا سے ملنے کے لیے رحمٰن آباد گئے تو ان کے چہرے پر وہی رونق تھی اور آنکھوں میں وہی شوخی اور چمک۔۔۔۔ بہت محبت سے ملے۔ تواضع کی۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر اپنے کھیتوں کی سیر کرانے کے لیے باہر لے گئے۔ ہم نے دو تین گھنٹے مولانا کے ساتھ گزارے۔ اس دوران میں انھوں نے ایک لفظ بھی اپنی تنگیِ حالات کے بارے میں نہ کہا۔ نہ اس ماحول کا ذکر کیا جس میں وہ بڑھاپے کے ماہ و سال گزارنے اور علمی و تحقیقی کام کرنے پر مجبور تھے۔ البتہ اس بات پر بہت مسرور اور مطمئن تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اتنی مہلت دی ہے کہ وہ اپنی تفسیر مکمل کر سکیں اور استاد نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو امانت ان کی سپرد کی تھی، اسے کتابی شکل میں منتقل کر سکیں۔'' (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۴۴)

لاہور واپسی

گاؤں میں امین احسن کی واحد پریشانی طبی سہولتوں کی کمی تھی۔ اصل میں ان کی اہلیہ محترمہ شوگر کی مریضہ تھیں۔ جب ان کی حالت خراب ہوتی تو امین احسن بہت پریشان ہو جاتے تھے۔ بالآخر یہی پریشانی انھیں ۸ برس بعد لاہور واپس لے آئی۔ ۱۹۷۹ء میں وہ لاہور منتقل ہو گئے۔

بیٹی کے گھر میں رہنا

لاہور آنے کے بعد امین احسن اپنی بیٹی محترمہ مریم صاحبہ کے گھر رہے۔ آپ کے داماد میجر محمد انور صاحب تھے۔ محترم جاوید احمد غامدی کے شاگرد اور خالد مسعود صاحب کے داماد نعیم احمد بلوچ صاحب بتاتے ہیں کہ میں اور محمد احسن تہامی صاحب یہاں جایا کرتے تھے۔ کبھی لان میں بیٹھ جایا کرتے تھے اور کبھی کمرے میں۔ ہماری چائے کے ساتھ تواضع ہوتی تھی اور چائے کے ساتھ ضرور کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔ پہلے ہم بے قاعدہ طریقے سے جاتے تھے، پھر ہم نے ایک دن طے کر لیا۔ اگرچہ ہم نے اس کا اعلان نہیں کیا تھا، اس کے باوجود مولانا کو ہمارا انتظار رہتا تھا۔ ایک دفعہ ہم نہیں گئے تو مولانا نے کسی سے کہا: وہ لوگ کہاں گئے؟ چڑیاں اڑ گئیں؟ ہمیں اس بات کا علم ہوا تو بڑا فخر محسوس ہوا۔ مولانا کہا کرتے تھے کہ میں اپنی بیٹی کے گھر رہتا ہوں۔ میں راجپوت ہوں۔ راجپوتوں کے ہاں یہ بڑی شرم کی بات ہے، لیکن یہ جاہلانہ بات ہے۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس وقت مریم صاحبہ کا بیٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔

Monthly
ISHRAQ
Lahore

August 2024
Vol.36 No.8
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق